باب ششم

ابراہیمیؑ مذاہب کا

''ثالثُ ثلاثہ''

''ثالث ثلاثہ'' کے الفاظ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ کی آیت ۷۳ میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں، یعنی ''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ'' (ترجمہ: ''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے!'')۔ ''ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ'' (''تین میں کا تیسرا'') کے ان الفاظ میں ایک طنز اور تعریض مضمر ہے، جس کے فہم کے لیے اس حقیقت کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اگرچہ تمام مشرکانہ مذاہب کے عقائد میں یہ قدر مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ اوپر ایک بڑے خدا کو مان کر اس کے نیچے بہت سے چھوٹے خداؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن پھر اصل خدائی چھوٹے خداؤں ہی کی ہوتی ہے، بڑا خدا تو بس ایک ''دستوری سربراہ'' بن کر رہ جاتا ہے (جیسے ٹھیٹھ پارلیمانی نظام میں صدر ریاست!) چنانچہ ہندوؤں کے نزدیک ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے جب کہ دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں۔ اسی طرح یونانی اور رومی میتھالوجی میں ''G'' سے لکھا جانے والا ''God'' تو ایک ہی ہوتا تھا، لیکن ''g'' سے لکھے جانے والے gods اور godesses اَن گنت تھے۔ اسی طرح اہل عرب اللہ کو تو واحد بھی مانتے تھے، اور بلاشرکت غیرے کل کائنات کا خالق اور مالک بھی تسلیم کرتے تھے، لیکن ان کے نزدیک اس کے تحت ''اِلٰہ'' بہت سے تھے جن کو اللہ نے جملہ اختیارات تفویض کر دیئے تھے۔ لیکن، جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا، پھر اصل پوجا پاٹ، چڑھاوے اور نذرانے چھوٹی دیویوں اور دیوتاؤں اور گاڈز اور گاڈیسز اور ہبل یا لات ومنات اور عزیٰ ہی کے لیے ہوتے تھے، بڑا خدا تو بس ''تین میں کا تیسرا'' بن کر رہ جاتا تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ابراہیمیؑ مذاہب کے ضمن میں عیسائیت کا ہے کہ وہ تعدادِ نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمیؑ مذاہب میں سب سے بڑا مذہب ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمیؑ مذاہب کی جانب اس کی نسبت صرف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے، ورنہ عقائد و نظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذہب ہے جس کا شمار ''فلسفیانہ مذاہب'' میں ہونا چاہئے نہ کہ ''آسمانی مذاہب'' میں، اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہئے نہ کہ حضرت مسیحؑ کی جانب۔

بہرحال ہم جس موضوع پر سلسلہ وار کلام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے اس مذہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمیؑ اُمتوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ چنانچہ سابقہ ابراہیمیؑ اُمت یعنی یہود پر چوتھی صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر جب سلطنت روما نے عیسائیت اختیار کی تھی بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط تک، گویا سولہ سو برس سے زائد عرصے تک، تشدد و تعذیب، قتل و غارت، جلاوطنی اور ملک بدری کا سلسلہ مختلف عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں جاری رہا۔ (حالات و واقعات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس پورے عرصے کے دوران میں یہودیوں کو اگر کوئی سہولت یا سہارا حاصل ہوا تو صرف ان مسلمانوں کی جانب سے جن کے وہ بدترین دشمن ہیں۔ چنانچہ انہیں کئی سو برس بعد یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کے ذریعے، پھر مکابی سلطنت کے زوال کے بعد یعنی لگ بھگ آٹھ سو برس بعد اگر انہیں کہیں امن وسکون اور چین کا سانس لینا نصیب ہوا تھا تو بنوعباس کے عہد خلافت میں، اور مسلم سپین کو تو ان کے زعماء اور دانشور برملا طور پر اپنے دورِ جلاوطنی یعنی ''Diaspora'' کا ''عہد زریں'' قرار دیتے ہیں) اسی طرح موجودہ ابراہیمیؑ اُمت یعنی اُمت مسلمہ پر بھی گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے مسلسل عذابِ الٰہی کے کوڑے عیسائیوں کے ہاتھوں پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ اوّلاً گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران صلیبیوں نے شام، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا، چنانچہ ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام تو تاریخ انسانی کے بدترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ پھر تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کے دوران عیسائیوں نے تدریجاً ہسپانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کیا، تا آنکہ سولہویں صدی کے اوائل میں پورے جزیرہ نمائے آئی بیریا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹ گیا اور یورپ کے جنوب مغربی علاقے سے ''نسلی صفائی'' (Ethnic Cleansing) کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا (جواب پانچ سو برس بعد یورپ کے جنوب مشرقی کنارے یعنی بلقان کے علاقے میں ہو رہا ہے۔) بعد ازاں یورپ کی عیسائی اقوام کا سیلاب واسکوڈی گاما کے دریافت کردہ بحری راستے کے ذریعے مشرقِ اقصیٰ کے مسلمان ممالک پر ٹوٹ پڑا، اور سترھویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران جاوا، ملایا، سماٹرا اور ہندوستان سے مسلمان حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے بالآخر یہ سیلاب بیسویں صدی کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کو بھی بہا کر لے گیا اور پورا شرقِ اوسط اور شمالی افریقہ بھی عیسائی اقوام کے زیر نگیں آ گیا۔ بقول علامہ اقبال:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

الغرض، یہودیوں کے لیے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کے لیے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اور، جیسے کہ سطورِ گذشتہ میں واضح کر دیا گیا تھا، اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص ''واسپ'' (WASP) یعنی "White Anglo Sexen Protestants" یہودیوں کے بظاہر معاون ومحافظ اور مددگار اور سرپرست، اور بباطن ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' کے مطابق زیرنگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور ''ترسم کہ دِگر خیزد'' کے مصداق اندیشہ ہے کہ عنقریب مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار ''حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ''[1] کی سی شان کے ساتھ عالم اسلام بالخصوص شرق اوسط پر ہونے والی ہے، جس کی صریح پیشین گوئیاں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں اور جس کی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔ اور جس کے آئندہ بھیانک تر مرحلے کا جواز فراہم کرنے کے لیے ''مسلم فنڈ فنڈا منٹلزم'' کا ہوا کھڑا کیا جا رہا ہے، جس کے ضمن میں حال ہی میں ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا''[2] کے مصداق امریکی پروفیسر ڈاکٹر ایکپوزیٹو نے اپنی حالیہ تالیف میں یہ ''سچی بات'' غالباً کسی ''مستی'' کے عالم میں کہہ دی ہے کہ ''مغرب یا عالم عیسائیت کو اسلام کی جانب سے کسی خطرے یا اندیشے کا واویلا بالکل بے جا اور غیر واقعی ہے، اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک عیسائی دنیا کو کبھی کوئی گزند اسلام کی جانب سے نہیں پہنچا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے برعکس ہمیشہ عالم اسلام ہی کو عیسائی دنیا کی جانب سے نقصان پہنچتا رہا ہے۔''

[1] سورۃ الانبیاء آیت: ۹۶ [2] سورۂ یوسف آیت: ۲۶

لیکن اس سے قبل کہ ہم ''آنے والے دور کی'' صرف ''دھندلی سی اِک تصویر'' نہیں بلکہ وہ واضح تصویر دیکھیں جو احادیث میں موجود ہے، آیئے کہ پہلے موجودہ دنیا میں مذاہب کے اعتبار سے ''انسانی جغرافیہ'' پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر ابراہیمیؑ مذاہب خصوصاً عیسائیت کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں۔

اِس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی ساڑھے پانچ یا پونے چھ ارب کے لگ بھگ ہے (ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں یہ آبادی چھ ارب تیس کروڑ ہو جائے گی) اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمیؑ مذاہب کی پیروکار ہے۔ چنانچہ شکاگو کے عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ ''نیشنل کانفرنس'' نے ۱۹۹۰ء میں جو ''انٹرفیتھ کیلنڈر'' شائع کیا تھا اس کے مطابق اب سے تین سال قبل دنیا میں یہودیوں کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم، مسلمانوں کی ایک ارب سے زائد اور عیسائیوں کی پونے دو ارب کے لگ بھگ (اینگلی کن چرچ سات کروڑ، کیتھولک نوے کروڑ، آرتھوڈوکس تیرہ کروڑ اور پروٹسٹنٹ تریسٹھ کروڑ) تھی۔ اس میں اگر ان دو عوامل کا اضافہ کر لیا جائے کہ اوّلاً یہودیوں اور عیسائیوں میں تو آبادی کا اضافہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، جب کہ مسلمانوں کے بارے میں مسلم ہے کہ ان کی آبادی میں شرح اضافہ بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ثانیاً مسلم اقلیت والے ممالک (بالخصوص بھارت) میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھائی جاتی ہے، تو محتاط اندازے کے مطابق اِس وقت دنیا میں ایک ارب تیس کروڑ (بعض لوگوں کے خیال میں پونے دو ارب) مسلمان موجود ہیں (واللہ اعلم)۔ مذکورہ بالا کیلنڈر کے مطابق ۱۹۹۰ء میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی یعنی پینسٹھ کروڑ سے زائد، پھر بدھ مت کے پیروکار تھے یعنی پچیس کروڑ کے لگ بھگ، پھر سکھ تھے یعنی تقریباً پونے دو کروڑ، اور باقی صرف لاکھوں میں۔ ان میں بھی تین سال کے عرصے کے دوران کا اضافہ شامل کر لیا جائے اور پھر اس میں ایک ارب کے قریب لامذہب یا نیچر ورشپ والے لوگوں کو جمع کر لیا جائے تو کل حاصل جمع وہی بن جاتا ہے جو اوپر دیا گیا۔

قرآن حکیم پر ایمان اور قرآن کے فلسفۂ تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک دین برحق اسلام ہی رہا ہے۔ اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں، لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقولِ جگر مراد آبادی ع ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!'' البتہ صرف دو مذہب وہ ہیں جن کا اصل ''اسلام'' کے ساتھ تعلق اور تسلسل کم از کم تاریخی اعتبار سے ثابت ہے یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ ان میں سے بھی اصل مسلمان امتیں دو ہی ہیں، یعنی سابقہ اُمت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہوگا، لیکن مستقبل قریب میں ابتداءً نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمیؑ مذاہب کے ''تین میں کے تیسرے'' مذہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔ لہٰذا ان کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

موجودہ عیسائی مذہب اگرچہ ان چار بڑے بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (بلکہ ان کی مزید تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت بائیس ہزار سے زائد ''چرچ'' وجود میں آ چکے ہیں)، تاہم ان سب کے مابین تثلیث، صلیب اور کفارہ کے عقائد متفق علیہ ہیں۔ قرآن حکیم تثلیث کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہی ہے، اس خیال کی بھی پرزور تردید کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ سولی پر چڑھائے گئے جہاں ان کی موت واقع ہوئی، جس سے کفارے کا عقیدہ بھی خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ اگرچہ صلیب کا

واقعہ تو اناجیل اربعہ میں موجود ہے، لیکن تثلیث یا ابنیت مسیحؑ کے عقیدے کی کوئی بنیاد ان میں ہرگز موجود نہیں، اور ان کا اوّلین سراغ تو اگرچہ سینٹ پال کی تحریروں میں مل جاتا ہے، تاہم انہیں باضابطہ اور سرکاری طور پر طے شدہ عقائد کی حیثیت بہت بحث وتمحیص اور جدل ونزاع کے نتیجے میں حضرت مسیحؑ کے لگ بھگ تین سو برس بعد حاصل ہوئی اور اس عرصے کے دوران موحدین اور تثلیث کے قائلین کے مابین شدید خون خرابہ بھی ہوا۔ جہاں تک حضرت مسیحؑ کی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے چند امور تو وہ ہیں جو ایک جانب قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہؐ اور دوسری جانب اناجیل اربعہ کے مابین مشترک ہیں، لہٰذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین متفق علیہ عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ بعض امور ایسے ہیں جن میں قرآن اور اناجیل تو متفق ہیں، لیکن سینٹ پال کی ترامیم کے باعث عیسائیت ان کی قائل نہیں اور بعض امور ایسے بھی ہیں جو قرآن اور اناجیل کے مابین بھی مختلف فیہ ہیں۔ چنانچہ متفق علیہ امور تو یہ ہیں کہ:

۱) حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوئی لیکن چونکہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسرائیلی تھیں، لہٰذا حضرت مسیحؑ کا تعلق بھی نبی اسرائیل سے ہے۔

۲) ان کے دست مبارک سے ایسے عظیم معجزے صادر ہوئے جن کی نہ کوئی دوسری مثال موجود ہے نہ ہی ان سے بڑے حسی معجزوں کا تصور ممکن ہے۔ جیسے مردوں کو زندہ کر دینا، گارے سے پرندے کی صورت بنانا اور پھر اس میں پھونک مار کر اسے زندہ اور اُڑتا ہوا پرندہ بنا دینا وغیرہ۔ (واضح رہے کہ قرآن حکیم معنوی اور ابدی معجزہ ہونے کے اعتبار سے ان جملہ معجزات سے افضل ہے، لیکن اس کا اعجاز صرف دل کی آنکھ اور عقل کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، سر کی آنکھ سے نہیں!)۔

۳) انہوں نے یہودیوں میں توبہ کی زبردست منادی کی اور انہیں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی زوردار دعوت دی، اور اس ضمن میں ان کے علماء، مفتیوں، قاضیوں اور ان کی ریاکارانہ مذہبیت پر شدید تنقیدیں کیں، چنانچہ مذہب کے یہ اجارہ دار طبقات آنجنابؑ کے شدید دشمن اور جان کے درپے ہو گئے۔

۴) ان کی زوردار دعوت کا شور اور غلغلہ تو بہت بلند ہوا، اور یروشلم اور آس پاس کے علاقے کے یہودی عوام اس سے متاثر بھی بہت ہوئے، لیکن ان پر ایمان بہت ہی کم لوگ لائے اور ان میں سے بھی صرف چند حواری ایسے تھے جو ان کے دن رات کے ساتھی اور دل وجان سے فدائی تھے۔ (اناجیل کی رُو سے ان کی تعداد بارہ تھی، اگرچہ مختلف اناجیل میں ناموں کا اختلاف ہے)۔

۵) بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھا لیا اور قیامت کے قریب وہ دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل اور نہایت توجہ کے قابل ہے کہ دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ مبارکہ کے بارے میں ان پانچ امور پر متفق ہے، جن میں سے بعض باتیں نہایت غیر معمولی اور خالص خرقِ عادت یعنی دنیا کے عام طبعی قوانین کے بالکل برعکس ہیں!

اب آیئے ان دو نہایت اہم اور اساسی امور کی جانب جن پر قرآن وحدیث اور اناجیل اربعہ تو متفق ہیں، لیکن سینٹ پال کی اختیار کردہ ترمیمی آراء اور اقدامات کی بناء پر موجودہ عیسائیت کا موقف اور طرزِ عمل ان سے مختلف نہیں متضاد ہے۔ وہ دو امور حسب ذیل ہیں:

۱) حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی نئی شریعت لائے تھے، نہ ہی انہوں نے شریعت موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو منسوخ کیا، بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ ہی کی لائی ہوئی شریعت کی تجدید وتوثیق اور بنی اسرائیل کی اخلاقی وروحانی اصلاح اور دین کی حقیقی روح کے احیاء کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ گویا وہ اپنی ذات کی حد تک سابقہ اُمت مسلمہ ہی سے تعلق رکھتے تھے اور کسی نئے دین ومذہب یا ملت واُمت کے بانی نہیں تھے۔ چنانچہ مشہور زمانہ تالیف "The 100" کے مؤلف ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جب تک حضرت مسیحؑ دنیا میں موجود رہے، آپؑ اور آپؑ کے ساتھیوںؓ کی حیثیت یہودیت کی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ فرقے کے علاوہ کچھ نہ تھی! گویا موجودہ مسیحیت کے اصل بانی حضرت مسیحؑ نہیں، سینٹ پال ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ شریعت موسویؑ کو عیسائیوں کے لیے منسوخ قرار دیا، بلکہ خود شریعت ہی کی کلی نفی کر دی اور اسے (معاذ اللہ) ''لعنت'' قرار دیا۔

۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ چنانچہ آنجنابؑ نے خود اپنی دعوت اور خطاب کو بھی صرف بنی اسرائیل تک محدود رکھا اور صاف فرمایا: ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!'' اور اپنے شاگردوں کو بھی سختی کے ساتھ منع فرما دیا کہ اپنی دعوت وتبلیغ کے دائرے کو بنی اسرائیل کے باہر وسعت نہ دیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ''انقلابی قدم'' سینٹ پال ہی نے اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کی چالیس کی دہائی کے دوران اس معاملے میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں کے محدود حلقے میں شدید بحث ونزاع کا بازار گرم رہا، لیکن بالآخر فتح سینٹ پال اور ان کے حامیوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد عیسائیت کو اصل فروغ غیر اسرائیلی اقوام ہی میں ہوا، اور آج عیسائیوں میں نسلی طور پر بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تناسب آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی بہت کم ہے۔

آخر میں اس واحد اہم اور اساسی امر پر بھی نگاہ ڈال لیں جس کے معاملے میں ایک جانب قرآن وحدیث اور دوسری جانب اناجیل اربعہ میں واضح اختلاف بلکہ کھلا تضاد ہے.....یعنی یہ کہ اناجیل اربعہ کے مطابق یہودی علماء کے فتوے اوران کی مذہبی عدالت کے فیصلے کے مطابق، بلکہ ان کے اصرار پر رومی حاکم پیلاطس پونٹس نے حضرت مسیح ؑ کو سولی پر چڑھادیا جہاں ان کی موت واقع ہوگئی، اگرچہ بعد میں جب کہ ان کا جسد خاکی ایک غار میں رکھا ہوا تھا وہ زندہ ہوگئے اور اپنے بعض شاگردوں کو اپنی واپسی اور دوبارہ دنیا میں آنے کی نوید سنا کر آسمان پر چلے گئے۔ جب کہ قرآن حکیم ان کے مصلوب یا قتل ہونے کی شدت سے نفی کرتا ہے اور صحیح اور مستند ترین احادیث صراحت کرتی ہیں کہ آنجنابؑ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے اور اس کے بعد ہی آپؑ پر طبعی موت کا مرحلہ آئے گا۔ تاہم قرآن اور حدیث دونوں میں یہ تفصیل موجود نہیں ہے کہ آنجنابؑ کا رفع سماوی کب، کہاں اور کس مرحلے پر ہوا اور آپؑ کی جگہ کون مصلوب ہوا۔ البتہ یہ خلابہ تمام وکمال انجیل برنباس کے ذریعے پر ہو جاتا ہے، یعنی عین اُس وقت جب حضرت مسیحؑ کے ایک غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کی مخبری پر رومی سپاہی آنجنابؑ کی گرفتاری کے لیے اس باغ میں داخل ہوئے جہاں آپؑ روپوش تھے، اللہ کے حکم سے چار فرشتے نازل ہوئے جو آنجنابؑ کو اٹھا کر لے گئے، اور اس غدار حواری کی صورت آپؑ کے مشابہ بنادی گئی۔ چنانچہ وہی گرفتار ہوا اور بالآخر مصلوب ہو کر کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ (واضح رہے کہ عیسائی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سینٹ برنباس حضرت مسیح ؑ کے اوّلین مبلغین میں سے تھے، یہاں تک کہ ابتداء میں خود سینٹ پال کی حیثیت ان کے نائب کی تھی، لیکن متذکرہ بالا انجیل کی نسبت ان کی جانب درست نہیں سمجھتے، بلکہ اسے جعلی اور فرضی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپؐ کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ بکثرت موجود ہے لہٰذا عیسائی اسے کسی مسلمان کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس خیال کی تردید کے لیے صرف یہ ''قرائن کی شہادت'' کفایت کرتی ہے کہ اگر واقعتاً ایسا ہوتا تو اس انجیل کا تذکرہ مسلمانوں کے لٹریچر میں ہونا لازمی تھا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا حوالہ پورے مسلم لٹریچر میں کہیں موجود نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی جملہ تفاسیر حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے وقت اور مقام کی تفاصیل اور اس سوال کے جواب سے خالی ہیں کہ حضرت مسیحؑ علیہ السلام کی جگہ کون شخص مصلوب ہوا؟ اس لیے کہ قرآن حکیم حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے، لیکن واقعۂ صلیب کی مطلق نفی نہیں کرتا۔)

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور تورات اور عہد نامۂ قدیم کی دیگر کتابوں کی بائبل میں شمولیت کی بناء پر عیسائیت ابتداء میں یقیناً ابراہیمیؑ مذاہب ہی کے سلسلے کی کڑی تھی، لیکن چونکہ زیادہ سے زیادہ تین سو سال بعد اس کی کامل قلب ماہیت ہوگئی تھی، چنانچہ موجودہ عیسائیت اپنے عقائد یعنی تثلیث، صلیب اور کفارہ کے حوالے سے اور شریعت موسویؑ سے انقطاع کے باعث ایک بالکل علیحدہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے جو آسمانی مذاہب کے مقابلے میں فلسفیانہ مذاہب سے قریب تر ہے، لہٰذا اب اس کی بقیہ دونوں ابراہیمیؑ مذاہب سے کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ ''آنے والے دور'' میں حضرت مسیحؑ کا نزول یا آپؑ کی آمد ثانی بجائے خود بھی نہایت اہم واقعہ ہوگا اور اس پر مستزاد اہم ترین عالمی تبدیلیوں کی تمہید بنے گا (اگرچہ آنجنابؑ کے نزول یا آمد ثانی کا مقصد ناجیل سے واضح نہیں ہوتا، بلکہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے اور وہ قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جس پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے، تاہم اس پر مفصل کلام بعد میں ہوگا) مزید برآں، چونکہ اس سے بھی پہلے ایک جھوٹا، مکار اور دجال شخص حضرت مسیحؑ ہی کے نام پر دنیا میں عظیم فساد برپا کرے گا، جس کی واضح پیشینگوئیاں احادیث نبویہؐ میں بھی موجود ہیں اور عہد نامہ جدید میں بھی، لہٰذا ضروری ہے کہ اناجیل اربعہ کے ساتھ تقابل سے قطع نظر، مثبت طور پر قرآن اور حدیث کے حوالے سے حضرت مسیحؑ کی شخصیت پر مزید روشنی ڈال دی جائے۔ (واضح رہے کہ متذکرہ بالا جھوٹے اور مکار شخص کو احادیث نبویہؐ میں ''المسیح الدجال'' کا نام دیا گیا ہے، اور عیسائی دنیا اسے "Anti-Christ" کے نام سے جانتی ہے۔ اور آج کل سولہویں صدی عیسوی کے ایک فرانسیسی نژاد، یہودی النسل عیسائی درویش ''ناسٹرے ڈیمس'' کی پیشینگوئیوں پر مبنی وڈیو کیسٹوں کے ذریعے اس کا بہت چرچا مغربی دنیا میں ہو رہا ہے، اور اگرچہ عیسائی کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ قدیمی اور روایتی دشمنی کی بناء پر یہ پروپیگنڈا اشد ومد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ یہ اینٹی کرائسٹ عرب مسلمانوں میں سے ہوگا تاہم اس سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے ہوگا یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تصور بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے) بہرحال حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآن حکیم اور احادیث رسولؐ کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آنجنابؑ اللہ کے محبوب بندے، برگزیدہ نبی، اور جلیل القدر رسول تھے۔ بحیثیت نبی آپؑ سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کی آخری کڑی تھے اور بحیثیت رسول آپؑ کی بعثت بھی بنی اسرائیل ہی کی جانب تھی۔ آپؑ کی بعثت کا مقصد دین موسویؑ ہی کی تجدید وتوثیق اور اس میں پیدا کردہ تحریفات کا ازالہ اور یہودیوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح تھا۔ مزید برآں آپؑ ایک جانب ان پیشینگوئیوں کے مصدق ومصداق بن کر آئے تھے جو انبیاءِ بنی اسرائیل یہود کے ایک نجات دہندہ کے ظہور کے بارے میں کرتے آئے تھے، اور دوسری جانب آپؐ خاتم النبیین اور آخر المرسلین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشر اور منادی کرنے والے بن کر آئے [1] تھے، آپؑ کی ولادت چونکہ بن باپ کے ہوئی تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اپنی جانب سے ایک خاص

روح اور اپنا ایک خصوصی کلمہ قرار دیا جو آپؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کی جانب القاء کیا گیا،[۲] ولادت کے فوراً بعد آپؑ سے یہ عظیم معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپؑ نے پنگھوڑے میں سے بول کر اپنی والدہ ماجدہ کی پاکدامنی کی بھی گواہی دی اور اپنی نبوت و رسالت کا بھی اعلان[۳] کیا۔

۱ سورۃ الصّف آیت:۶ ۲ سورۃ النساء آیت:۱۷۱ ۳ سورۂ مریم آیات:۲۹ تا ۳۱

پھر جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے آپؑ کو عظیم ترین حسی معجزات عطا کئے گئے۔ گویا کہ بنی اسرائیل پر آپؑ کے ذریعے آخری درجہ میں اتمام حجت کر دیا گیا، لیکن اس سب کے باوجود یہود کی اکثریت بالخصوص ان کے علماء نے آپؑ کی تصدیق نہیں کی، بلکہ آپؑ کی والدہ ماجدہ پر بدکاری کی تہمت لگا کر آپؑ کو (معاذ اللہ) ولدالزنا بھی قرار دیا اور جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر واجب القتل بھی ٹھہرایا، اور اپنے بس پڑتے تو آپؑ کو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ''وہ نہ آپؑ کو قتل کر سکے نہ صلیب دے سکے، بلکہ اللہ نے آپؑ کا معاملہ ان کے لیے مشتبہ بنا دیا.....'' اور انہوں نے آپؑ کو ہرگز قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے آپؑ کو اپنی جانب اٹھا لیا!''[۱] مزید برآں، قرآن نے بھی آپؑ کو ''عِلمٌ لِّلسَّاعَةِ''[۲] (قیامت کی ایک نشانی) قرار دیا ہے، اور احادیث نبویہؐ میں تو یہ بات تواتر اور غایت درجہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ آپؑ قیامت سے قبل نازل ہوں گے اور جھوٹے اور فریبی مسیح یعنی ''المسیح الدجال'' کو بہ نفس نفیس خود قتل کریں گے۔

۱ سورۃ النساء آیات:۱۵۷۔۱۵۸ ۲ سورۃ الزخرف آیت:۶۱

''آنے والے دور'' کی ایک دھندلی نہیں واضح تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو بھی تاریخی حقائق کے پس منظر میں سمجھ لیا جائے کہ یہ انقلابِ عظیم کیسے رونما ہوا کہ وہ یہودی جو ایک ہزار برس تک عیسائیوں کے نزدیک ارذِل خلائق اور مبغوض ترین لوگ رہے اور ان کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے رہے رفتہ رفتہ اس پوزیشن میں آ گئے کہ اس صدی کے اوائل میں نابغۂ عصر اور ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز'' علامہ اقبال نے اپنے انگلستان اور جرمنی کے مختصر سے قیام کے دوران وہ حقیقت بچشم دِل دیکھ لی تھی جو آج پوری دنیا بچشم سر دیکھ رہی ہے، یعنی ع ''فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے!''

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں واضح کیا ہے کہ ''ہم نے ان کے (یعنی یہود اور نصاریٰ کے) مابین قیامت کے دن تک کے لیے بغض اور عداوت پیدا کر دی ہے!''[۳]

۳ سورۃ المائدہ آیات:۱۴ تا ۶۴

قرآن حکیم پر یقین رکھنے والا ہر سنجیدہ طالب علم اس سے یہ دو نتائج لازماً اخذ کرے گا کہ اوّلاً..... یہودیوں اور عیسائیوں کا موجودہ ''گٹھ جوڑ'' محض ظاہری اور سطحی ہے اور ثانیاً: اب دنیا کا خاتمہ اور ''اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ'' کا مرحلہ زیادہ دور نہیں ہے، لیکن سردست ان حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلقات کے تین ادوار پر مرکوز کر دیجئے جن کا مختصر بیان حسب ذیل ہے:

۱) پہلا دَور عیسوی تقویم کی پہلی تین صدیوں پر محیط ہے جن کے دوران پیروانِ مسیحؑ کی تعداد قلیل تھی (اور ان میں معتد بہ تعداد حضرت عیسیٰؑ کے اصل موحد پیروکاروں کی بھی شامل تھی) چنانچہ ان پر دو جانب سے تشدد ہو رہا تھا، یعنی ایک یہودیوں کی طرف سے، اور دوسرے بت پرست رومیوں کی جانب سے۔

۲) اس صورتِ حال میں انقلاب چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں آ گیا جب سلطنت روما نے عیسائیت قبول کر لی۔ لہٰذا اب معاملہ برعکس ہو گیا اور یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور انہیں بدترین تشدد اور تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس لیے کہ وہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کے قاتل تھے، جن کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کا ''غلو''[۱] اس درجہ شدید تھا کہ انہیں الوہیت میں شریک کر دیا تھا۔ یہ دَور کم و بیش ایک ہزار سال تک جاری رہا۔

۱ سورۃ النساء آیت:۱۷۱

۳) اِس صورت حال میں جو انقلاب تدریجاً برپا ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر یہودیوں اور عیسائیوں کا وہ ''گٹھ جوڑ'' پیدا ہوا جس کی پیشگی خبر قرآن حکیم نے ''بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ''[۲] کے الفاظ میں دے دی تھی، وہ یہودی سیاست اور ذہانت کا شاہکار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کو آلۂ کار بنایا۔

۲ سورۃ النساء آیت ۵۱

چنانچہ پہلے انہوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی، اس لیے کہ ہسپانیہ کے عیسائی ان کے بدترین دشمن تھے اور انہیں توہین و تذلیل ہی نہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ بنا رہے تھے اور دنیا کا مسلم اصول ہے کہ کسی کے دشمن کا دشمن اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ وہ نکلا جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے یعنی مسلم سپین ان کے لیے امن اور عافیت کا گہوارہ بن گیا۔ چنانچہ اسی سرزمین کو انہوں نے عیسائیت کے قلعے میں نقب لگانے کے لیے استعمال کیا اور غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم کے جو سوتے پھوٹ کر فرانس اور جرمنی کی جانب بہہ نکلے ان پر ''لبرلزم'' کے عنوان سے ذہنی و فکری آوارگی اور اخلاقی و عملی بے راہ روی کے اضافی ردے چڑھا کر یورپ کے عیسائی معاشرے میں اپنے اثر و نفوذ کی راہیں ہموار کر لیں، اور پھر جب اوّلاً احیاء العلم (Renaissance) اور اصلاحِ مذہب (Reformation) کی تحریکوں، اور بالآخر پوپ کے اختیارات اور کلیسا کے اقتدار کے خلاف احتجاج (Protest) کی تحریک کے نتیجے میں پاپائیت کی گرفت کمزور پڑی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف ممالک میں اس سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی جو اس سے قبل عیسائی یورپ میں مطلقاً حرام اور ممنوع تھا۔ اور اس طرح ایک جانب فکری و اخلاقی آوارگی کے جال، اور دوسری جانب سودی معیشت کے چنگل میں پھنسا کر یہود نے یورپ کے عیسائی معاشرے پر اپنی وہ گرفت مضبوط کر لی جو رفتہ رفتہ شدید سے شدید تر ہو کر بالآخر آج اس صورت میں موجود ہے کہ پورے عالم عیسائیت پر فیصلہ کن غلبہ ''واسپ'' (White Anglo Sexen Protestants) کا ہے جن کے مضبوط ترین گڑھ انگلستان اور امریکہ ہیں..... اور خود ان کے سر پر سوار ہے صیہونیت کی بدنامِ زمانہ یہودی تحریک۔ چنانچہ یہ اسی کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ دو ہزار سال سے قائم شدہ عقیدے کے برعکس چند سال قبل پاپائے روم نے ایک خصوصی حکم نامے کے ذریعے یہودیوں کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے الزام سے بری کر دی..... ع ''کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!'' واقعہ یہ ہے کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!'' کی اس سے زیادہ نمایاں مثال دنیا کی پوری تاریخ میں شاید ہی کبھی سامنے آئی ہو۔

۱۲/مئی ۱۹۹۳ء

باب ہفتم

''آنے والے دَور'' کی ایک واضح تصویر

علامہ اقبال نبوت تو درکنار، ولایت تک کے مدعی نہیں تھے ع ''میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ!'') گویا وہ صرف ایک نابغہ انسان تھے۔ اس کے باوجود ایک جانب ع ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دل و وجود!'' کے مصداق ان کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے تقریباً پون صدی قبل اس حقیقت کا مشاہدہ کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' بچشم قلب کر لیا تھا جو آج پوری دنیا کو بچشم سر نظر آ رہی ہے، اور دوسری جانب وہ ایک وژنری بھی تھے اور اپنے مستقبل کی وژن پر انہیں جو اعتماد اور یقین حاصل تھا وہ ان کے ان اشعار سے عیاں ہے کہ ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ افکار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!

اور ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

مزید برآں اپنی اس مستقبل اندیشی اور ''عاقبت بینی'' میں انہیں جس قدر جذب اور انہماک حاصل تھا وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے، جو انہوں نے ہسپانیہ میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع جامع قرطبہ میں کہا تھا، یعنی ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور ان کی اس ''دور بینی'' نے انہیں ''آنے والے دور'' کے جو منظر دکھائے اس پر خود اپنی حیرت اور استعجاب کا اظہار انہوں نے یوں کیا کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

تو جب ایک غیر نبی نابغہ انسان کا عالم یہ ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے غور کیجئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ ''مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''[1] کے جو مشاہدات کراتا رہا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''مَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ''[2] اور ''اَرَيْنٰكَ ''[3] کا جو معاملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اس کی بناء پر جو پیشینگوئیاں آپؐ نے مستقبل کے حوادث و واقعات کے ضمن میں کی ہیں ان کے حتمی اور قطعی ہونے میں کسی شک کا کوئی امکان کسی مدعیٔ ایمان کے لیے کیسے ممکن ہے؟ لیکن افسوس کے عہد حاضر میں مادیت اور مادہ پرستی کی جو ہوائیں چلیں اور ان کے باعث جو نظریاتی اور اعتقادی فتنے خود مسلمانوں میں پروان چڑھے ان کے زیر اثر جدید تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ ان پیشینگوئیوں کو توجہ اور اعتناء کے لائق نہیں سمجھتا، اور اس ''مفتونیت'' کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اب بھی جب کہ وہ حوادث و واقعات جن کی خبر دی گئی تھی نوشتۂ دیوار کے مانند نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں، ان کو تسلیم کرنے سے اعراض ہی کی روش پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

[1] سورۃ الانعام، آیت: ۷۵ [2] سورۃ النساء، آیت: ۱۰۵ [3] سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۶۰

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں سب سے یقینی اور قطعی معاملہ تو اس دنیا کے خاتمے یعنی قیام قیامت کا ہے، جسے قرآن حکیم السَّاعَۃ، الواقعۃ، القارِعَۃ اور الحَاقّۃ ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے، اور جس کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر قرآن مجید کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تو اسلام اور ایمان کے بنیادی لوازم میں شامل ہے۔ تاہم اب سے تقریباً سوا سو برس قبل جو نئی ''سائنٹیفک عقلیت'' عالم اسلام پر حملہ آور ہوئی تھی، جس کی اساس نیوٹن کی فزکس پر تھی، اس نے قیامِ قیامت کو بھی موہوم اور مشکوک بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ اُس دور کی فزکس کے مطابق مادہ حقیقی بھی تھا اور دائمی و غیر فانی بھی، چنانچہ یہ تصور عام تھا کہ کائنات ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ تو بھلا ہو آئن سٹائن اور اس کے بعد کے علماءِ طبیعیات کا جن کے انقلاب آفریں انکشافات کے نتیجے میں مادہ بھی تحلیل ہو کر صرف انرجی کی صورت اختیار کر گیا، اور کائنات کے بارے میں بھی یہ حقائق تسلیم کر لیے گئے کہ یہ ایک خاص لمحے میں

ایک ''عظیم دھماکے'' (Big Bang) کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی (جو گویا اللہ تعالیٰ کے امر ''کن'' کی تعبیر ہے) اور ایک پھلجھڑی کے مانند چکر لگاتی ہوئی مسلسل کھل اور پھیل رہی ہے اور ایک خاص مدت کے بعد واپس برعکس سمت میں چکر لگاتی ہوئی تنگ ہوتے ہوئے بالآخر ایک نقطہ کی صورت اختیار کر لے گی، جیسے کہ متعدد کہکشائیں پہلے ہی ''سیاہ سوراخوں'' (Black Holes) کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال قبل ایک پاکستانی ماہر طبیعیات چوہدری بشیر الدین نے ایک کتاب بھی طبیعیات قیامت کے موضوع پر "Machanics of the Doomsday" کے نام سے تصنیف کر دی ہے،[1] جس میں واضح کر دیا ہے کہ پوری کائنات کی بڑی اور آخری قیامت سے قبل، جو ہو سکتا ہے کہ ابھی کافی دور ہو، اس کے جس حصے میں ہماری زمین واقع ہوئی ہے اس کی چھوٹی اور محدود قیامت واقع ہو سکتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ قریب ہی ہو۔ (جگر مرادآبادی نے تو نہ معلوم کس کیفیت میں یہ شعر کہا تھا نے ''اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری..... دنیا سے قیامت دور سہی، دنیا کی قیامت دور نہیں!'' لیکن اس میں ہو سکتا ہے کہ کچھ 'تواردٗ' متذکرہ بالا نظریئے کے ساتھ بھی ہو گیا ہو۔)

[1] شائع کردہ: ''ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن'' ۶۰۔ بی ناظم الدین روڈ، اسلام آباد

بہرحال ایمان کے نقطۂ نظر سے تو اصل اہمیت قیامت کے قرب یا بُعد اور اس کے ''مکینکس'' اور جزوی یا کلی ہونے کی نہیں اس کے ''یقینی'' ہونے کی ہے، اور انسان کی فوز و فلاح کے نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت کا معاملہ ''بعث بعد الموت'' یعنی موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر یقین کا ہے۔ اسی طرح ہماری اس وقت کی بحث اور گفتگو کے اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں، ان کے اعتبار سے اب یہ معاملہ زیادہ دیر اور دور کا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بعثت کو قربِ قیامت کی علامت قرار دیا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی نبی یا رسول کو نہیں، قیامت ہی کو آنا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ''میری بعثت اور قیامت آپس میں ایسے ملی ہوئی ہیں جیسے یہ دونوں انگلیاں!'' اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات ان الفاظ میں فرمائی جو ترمذیؒ نے مستورد ابن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کئے ہیں، یعنی: ''میں تو گویا عین قیامت ہی میں مبعوث کیا گیا ہوں اور میں نے اس سے صرف اتنی ہی سبقت کی ہے جتنی درمیانی انگلی انگشت شہادت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے''..... اور سردست ان خالص معجزانہ اور خرقِ عادت واقعات سے قطع نظر جو عین وقوعِ قیامت سے متصلاً قبل پیش آئیں گے، قربِ قیامت کی بعض اہم علامات کا تعلق صحرائے عرب اور اس کے بادیہ نشینوں کی اس حیرت ناک خوشحالی سے ہے جو آج سے سو سال قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی آنی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ (۱) اس ''حدیث جبرائیلؑ'' میں جو ''اُمُّ السُّنَّۃ'' یعنی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرے میں اسی مقام و مرتبے کی حامل قرار دی جاتی ہے جو قرآن حکیم میں سورۃ الفاتحہ کا ہے، اور جو صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں متعدد جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ قربِ قیامت کی ایک اہم علامت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ: ''تم دیکھو کہ وہ مفلوک الحال چرواہے جو کبھی ننگے پیر اور ننگے بدن ہوا کرتے تھے، عالی شان عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں!'' (۲) امام مسلمؒ نے جو حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اس میں قربِ قیامت کی علامت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ: ''دولت اتنی کثیر اور عام ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ نکالے گا لیکن اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا، (سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات کے مقامی باشندوں کی حد تک یہ صورت حال فی الواقع پیدا ہو چکی ہے) اور عرب کی زمین سبزہ زاروں اور چشموں کا منظر پیش کرنے لگے گی!'' اور (۳) سب سے بڑھ کر وہ حدیث جو امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت کی ہے، جس کی رُو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد نہ ہو جائے جس پر لوگ ایک دوسرے سے جنگ کریں گی، یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ مارے جائیں گے۔''

ان میں سے جہاں تک پہلی دو حدیثوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو خود ہی ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کی مصداقِ کامل ہیں، البتہ تیسری حدیث پر غور کے ضمن میں یہ چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں: (i) قدیم زمانے میں ملکوں کو دریاؤں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج تھا، چنانچہ یہاں فرات سے مراد عراق اور کویت ہیں۔ (ii) آج کے صنعتی دور میں سب سے زیادہ قیمتی متاع تیل ہے، جسے بجا طور پر ''سیال سونا'' کہا جاتا ہے۔ (iii) کوئی عجب نہیں کہ تیل کے وہ زیر زمین اور زیر سمندر سوتے بھی، جن سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تیل نکال رہے ہیں، وادیٔ فرات ہی کی جانب سے آتے ہوں۔ (iv) اس تیل کی دولت پر جو ''جنگ عظیم'' شروع ہوئی ہے دو سال قبل کی خلیج کی جنگ کو اس کے صرف نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ اسے صدام حسین نے ''اُمُّ المَعَارِب'' یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا تھا۔ اور (v) اس چند روزہ ''نقطۂ آغاز'' کے دوران جو قابل تصور حد تک وحشیانہ بمباری عراق پر ہوئی تھی اس کے پیش نظر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر جنگوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھے تو عراق اور کویت کی تباہی اسی درجہ کی ہو جائے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ ع ''حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں''۔

الغرض، راقم کو اگرچہ ان نجومیوں کی پیشینگوئیوں اور ماہرین فلکیات کی دی ہوئی خبروں سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے، جو دنیا کے خاتمے کو صرف قریب ہی نہیں قرار دے رہے ہیں بلکہ اس کا وقت بھی معین کر رہے ہیں (اگرچہ ''قرائن کی شہادت'' کے درجے میں وہ بھی قابل اعتناء ہیں!)، لیکن ان احادیث نبویہؐ کی بناء پر جن میں سے چند کا حوالہ اوپر دیا گیا، راقم کو یہ یقین حاصل ہے کہ دنیا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ (گویا ع ''دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!'' کے سے انداز میں) اپنے خاتمے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ (لطف یہ ہے کہ زمانہ اور وقت اور واقعات وحوادث کی اس تیز رفتاری کا نقشہ بھی ایک حدیث میں نہایت خوبصورت استعاراتی زبان میں کھینچ دیا گیا ہے، جسے امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، جس کی رو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمانہ مختصر نہ ہو جائے، جس کے نتیجے میں سال مہینے کے برابر نظر آنے لگے، مہینہ جمعہ (تا جمعہ یعنی ایک ہفتہ) محسوس ہونے لگے، جمعہ (یعنی ہفتہ) ایک دن کی طرح ہو جائے، دن ایک گھنٹے کے برابر محسوس ہو اور ایک گھنٹہ آگ کے ایک شعلے کی بھڑک کے مانند مختصر ہو جائے!''

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وقوعِ قیامت تو چونکہ قرآن مجید کا سب سے زیادہ کثیر الذکر موضوع ہے، لہٰذا اس سے تو کسی مسلمان کو مجال انکار ہو ہی نہیں سکتی، قرب قیامت کی ان علامات سے بھی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان ہوئی ہیں شاید ہی کوئی مسلمان اختلاف کرے، الا یہ کہ ان کے بعض الفاظ کی تعبیر و تاویل میں کسی جزوی اختلاف کی گنجائش ہو۔ اسی طرح عین وقوع قیامت کے وقت جن واقعات وحوادث کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ بھی جدید سائنسی نظریات کے پیش نظر کچھ ایسے مستبعد اور ''اَن ہونے'' نظر نہیں آتے، جیسے مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، یا زمین کا تین مقامات پر ''خسف'' یعنی بری طرح دھنس جانا، یا بہت عظیم آگ، یا بے پناہ دھواں! اس لیے کہ جدید طبیعیات کے نزدیک جس طرح اِس وقت کل کائنات ایک عظیم پھلجڑی کے مانند اپنے محور پر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہوئے کھلتی اور پھیلتی جا رہی ہے، اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ وہ برعکس رخ پر چکر کھاتی ہوئی سکڑتی اور سمٹتی چلی جائے گی، تو یہ کیا بعید ہے کہ اس بڑی قیامت سے قبل کی چھوٹی قیامت کے موقع پر نظامِ شمسی میں وہ اختلال پیدا ہو جائے اور زمین کی گردش ع ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!'' کے انداز میں مغرب سے مشرق کی بجائے مشرق سے مغرب کی جانب ہو جائے جس کے نتیجے میں سورج مغرب سے طلوع ہونے لگے۔ مزید برآں جیسے کہ سورۃ القیامہ کی آیات ۸ اور ۹ میں وارد ہوا ہے، چاند اور سورج یکجا ہو جائیں[1] اور چاند سورج میں دھنس جائے اور خود زمین پر بھی اتنے بڑے بڑے شہاب گریں کہ وہ تین جگہ سے بری طرح دھنس جائے اور اس دھنسنے کے باعث اس کے اندر کی گیس اور آگ کا طوفان ابل پڑے۔

[1] وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝

ترجمہ: ''اور چاند بے نور ہو جائے گا، اور سورج اور چاند یکجا ہو جائیں گے۔''

البتہ درمیانی عرصہ کے چار عظیم واقعات کے بارے میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تو ایک معتدبہ حصہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہے ہی، بہت سے ایسے علماء ومفسرین بھی مذبذب اور متردد ہیں، جو عہد حاضر (بلکہ صحیح تر الفاظ میں ماضی قریب) کی نیوٹن کی سائنس پر مبنی ''عقلیت پرستی'' کا شکار ہو گئے۔ ان چار عظیم واقعات کی جانب اشارات تو اگرچہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں، لیکن ان کی تفصیلی خبریں اور پیشینگوئیاں ان احادیث نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں جو کتاب الفتن کے مختلف ابواب میں شامل ہیں۔ ان عظیم واقعات کے مابین زمانی ترتیب یہ ہے: (۱) سب سے پہلے ''الملحمۃ الکبریٰ'' یعنی تاریخ انسانی کی ''عظیم ترین جنگ'' جس کی جانب اشارہ سورۃ الکہف کی دوسری آیت میں ''بَاْسًا شَدِیْدًا'' کے الفاظ میں وارد ہوا ہے، لیکن جس کی تفاصیل کتب حدیث کے ''باب الملاحم'' میں بیان ہوئی ہیں۔ (۲) ''المسیح الدجّال'' کا خروج اور اس کے ہاتھوں مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی عظیم تباہی یا بالفاظ دیگر اس کے ذریعے ''اُمّیین'' پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل۔ (۳) حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا آخری قلع قمع یا بالفاظِ دیگر اللہ کا عذابِ استیصال چنانچہ جہاں تک نزولِ عیسیٰؑ کا تعلق ہے اس کا بھی واضح اشارہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۱ میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ ''وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ'' یعنی ''وہ (یعنی عیسیٰؑ) ایک نشانی ہیں قیامت کی!'' اور بالآخر (۴) اسلام کا عالمی غلبہ اور پورے کرہ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت کے نظام کا قیام!

۱۷/مئی ۱۹۹۳

باب ہشتم

اسلام کا عالمی غلبہ یا
عالمی نظامِ خلافت کا قیام

قیامت سے قبل کے چار عظیم واقعات میں سے جہاں تک آخری یعنی اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے، اگرچہ اس کی کوئی قطعی نص تو کم از کم راقم کے علم کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے، تاہم منطق کے اس قضیئے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بہ تکرار واعادہ وارد ہوئے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ دین حق کا عالمی غلبہ ہے۔ چنانچہ تین بار قرآن حکیم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ: ''هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ''[1] یعنی ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کل کے کل دین (نظامِ زندگی) پر!'' اور دو مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ[2] یہ الفاظ بھی وارد ہوئے کہ: ''یہ لوگ (اور یہاں اصلاً مراد یہود ہیں، اس لیے کہ دونوں مقامات پر متصلاً قبل یہود ہی کا ذکر ہے) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے بجھا دیں جب کہ اللہ اپنے نور کو لازماً مکمل فرما کر رہے گا، خواہ یہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

[1] سورۃ التوبہ آیت: ۳۳، سورۃ الفتح آیت: ۲۸، سورۃ الصّف آیت: ۹

[2] سورۃ التوبہ آیت: ۳۲ اور سورۃ الصّف آیت: ۸

گویا ان پانچ آیات پر مشتمل تو صغریٰ ہے، اور کبریٰ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری نوعِ انسانی اور کل عالم انسانیت کی جانب ہے اور حسن اتفاق سے یہ مضمون بھی قرآن حکیم میں قدرے مختلف الفاظ میں پانچ ہی بار وارد ہوا ہے۔ یعنی: (۱) ''ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''[1] (۲) ''ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر''[2] (۳) ''بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرنے والا بن جائے!''[3] (۴) سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ اور ۳ میں فرمایا کہ آپؐ کی بعثت صرف ''اُمّیّین'' یعنی عربوں ہی کے لیے نہیں ''آخرین'' یعنی دوسروں کے لیے بھی ہے! اور (۵) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں آپؐ کو حکم دیا گیا: ''کہہ دیجئے کہ لوگو! میں تم سب کی جانب اللہ کا رسول ہوں!''[4] .....اب صغریٰ اور کبریٰ کو جمع کر لیجئے تو یہ لازمی منطقی نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد بہ تمام و کمال اسی وقت پورا ہوگا جب پورے عالم انسانی یعنی کل روئے ارضی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا حتمی غلبہ ہو جائے گا۔

[1] ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا: ۲۸)

[2] ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

[3] ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۝﴾ (الفرقان: ۱)

[4] ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

گویا بقول اقبال:ؔ

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

رہیں احادیث نبویہؐ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث مبارک تو وہ ہے جس کی رُو سے دنیا میں وہ نظام ایک بار پھر قائم ہو کر رہے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قائم ہوا تھا اور آپؐ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک اپنی کامل اور آئیڈیل صورت میں برقرار رہا۔ اسے امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی، (آپؐ کا اشارہ خود اپنی ذاتِ اقدس کی جانب تھا) جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھا لے گا۔ اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہوگی

اور یہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) ملوکیت آئے گی اور وہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر مجبوری کی ملوکیت (غالباً مراد ہے مغربی استعمار کی غلامی) کا دور آئے گا اور وہ بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا ——— اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی!'' راوی کے قول کے مطابق اس کے بعد آپؐ نے خاموشی اختیار فرمالی۔ (اور آپؐ کی یہ خاموشی بھی بلاسبب نہ تھی، تاہم اس کا بیان بعد میں ہوگا)۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جب وہ نظام دنیا میں دوبارہ قائم ہوجائے گا تو آسمان بھی اپنی ساری برکات نازل فرمادے گا اور زمین بھی اپنی تمام برکتیں باہر نکال کر رکھ دے گی۔ (چنانچہ بعض دوسری احادیث میں ان برکات کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں)

پھر دو نہایت اہم احادیث وہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جو خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہوگا وہ پورے عالم انسانیت اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا۔ چنانچہ (۱) صحیح مسلمؒ میں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ نے میرے لیے پوری زمین کو سمیٹ یا سکیڑ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی، اور سن رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوکر رہے گی جو مجھے سکیڑ یا لپیٹ کر دکھا دیئے گئے!'' اور (۲) مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت مقداد ابن الاسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ اونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کردے، خواہ کسی عزت کے مستحق کے اعزاز کے ساتھ اور خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ انہیں عزت دے گا اور اہل اسلام میں شامل کردے گا یا انہیں مغلوب کردے گا، چنانچہ وہ اسلام کی بالادستی قبول کرلیں گے!'' حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ ''تب وہ بات پوری ہوگی (جو سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں وارد ہوئی ہے) کہ دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہوجائے!''

الغرض، قیام قیامت اور دنیا کے خاتمے سے قبل کل روئے ارضی پر وہ دورِ سعادت یقیناً آکر رہے گا، جس میں ''اللہ ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنے والے مسلمانوں کو لازماً زمین کی خلافت اسی طرح عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو (مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو) عطا کی تھی، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو زمین میں لازماً تمکن عطا فرمادے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمالیا ہے، اور ان کی خوف زدگی کی کیفیت کو لازماً امن وسکون کی حالت سے تبدیل کردے گا!''[1].....

[1] ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ (النور :۵۵)

چنانچہ اسی کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی عہد حاضر کے وِژنری، عبقری اور نابغہ انسان علامہ اقبال کی ''نگاہِ تیز'' نے، جب انہوں نے کہا تھا:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور اس میں بھی ہرگز کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس دورِ سعادت کی نوید ہندو دھرم کی کتابوں میں بھی موجود ہے، اس لیے کہ جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے، دنیا کے تمام مذاہب اسلام ہی کی بدلی اور بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، چنانچہ ان سب میں مشکوٰۃِ نبوت کے انوار کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود اور برقرار ہے۔ چنانچہ پنڈت شری رام اچاریہ اپنی تحریر شائع شدہ ''اکھنڈ جیوتی'' بابت مارچ ۱۹۸۱ء میں لکھتے ہیں: ''ایسے ثبوت موجود ہیں کہ یگ بدلنے کا وقت آگیا ہے۔ کل یگ (جسے عرف عام میں کلجگ کہہ دیا جاتا ہے) اب وداع ہورہا ہے اور اس کی جگہ پر ایسا دور آرہا ہے جسے ست یگ (یعنی سچا زمانہ یا برحق زمانہ) کہا جاسکے۔ منوسمرتی، لنگ پران اور بھاگوت میں دیئے گئے اعداد وشمار کے مطابق حساب پھیلانے سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دور بحران کا دور ہے..... ان سب اعداد وشمار کو دیکھتے ہوئے وہ وقت ٹھیک ان ہی دنوں میں ہے جس میں یگ بدلنا چاہئے..... یعنی ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک بیس سال کا عرصہ۔''

(بحوالہ ''اگر اب بھی نہ جاگے تو.....'' تالیف مولانا شمس نوید عثمانی، شائع کردہ: روشنی پبلشنگ ہاؤس، بازار نصر اللہ خاں، رام پور۔ یوپی۔ بھارت).....تو اس وقت اِس امر سے تو بحث نہیں ہے کہ پنڈت جی کا حساب کتاب صحیح ہے یا نہیں، لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ دورِ سعادت کی یہ نوید اور خوشخبری قرآن حکیم کے اشارات (گویا دلالۃ النص) اور حدیث نبویؐ کی تصریحات (گویا عبارۃ النص) کے عین مطابق ہے۔ اس پر مزید اضافہ فرمالیجئے اس کا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی، جو عیسائیوں کے جملہ فرقوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے زمین پر ''آسمانی بادشاہت'' اور ''خدائی عدالت'' کے قیام ہی کے لیے ہوگی۔ گویا ع ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!'' کے مصداق اسلام کے نظامِ عدل وقسط، یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا عالمی سطح پر قیام اپنوں اور بیگانوں سب کے نزدیک مسلم ہے اور گویا تقدیر مبرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی یقیناً مفید ہوگا کہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' میں علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کی خاص فلسفیانہ سطح پر مدلل ترین اور مبسوط ترین تشریح کرنے والے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے قیامت سے قبل اسلام کے نظامِ عدل وقسط کے عالمی سطح پر قیام کو نظریۂ ارتقاء کا لازمی اور منطقی نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ارتقاء کی پہلی منزل خالص کیمیائی اور طبیعیاتی ارتقاء کی تھی جس کے نتیجے میں سادہ کیمیاوی عناصر نے ان پیچیدہ حیاتیاتی مرکبات کی صورت اختیار کی جن میں حیات کا ظہور ممکن ہوا۔ اس کے بعد حیاتیاتی ارتقاء کا عمل شروع ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔ پھر ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء کا سفر شروع ہوا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ پھر سماجی اور تمدنی ارتقاء کا آغاز ہوا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ اور آپؐ پر ''دین حق'' کی تکمیل اور سماجی اور تمدنی عدل وقسط کے نظام کے بالفعل قیام پر اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ اب ارتقاء کے اس طویل سفر کا صرف ایک ہی مرحلہ باقی ہے اور وہ ہے اس نظام کے عالمی سطح پر قیام کا.....اس کے بعد چونکہ موجودہ تخلیق جن اصول وقواعد اور حدود وقیود کے ساتھ ہوئی ہے ان میں ارتقاء کی کوئی اور جہت اور سمت ممکن نہیں ہے، لہٰذا اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اسی کا نام قیامت ہے۔ گویا قیامت سے قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ہونے والے دین حق کا پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی پر غلبہ سفر ارتقاء کی وہ آخری اور لازمی منزل ہے جس کی جانب وہ کاروانِ انسانیت کشاں کشاں رواں ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل بجا طور پر کہا تھا:

یا ز نور مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ ست!

البتہ ایک اور خبر جو بعض دوسری احادیث میں وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ ''ہر کمالے را زوالے'' کے مطابق اس دورِ سعادت کے بعد بھی ایک ایسا دور آئے گا جس میں پوری زمین پر ایک انسان بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہیں رہے گا، (مسلمؒ عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور دنیا میں صرف ''بدترین خلائق'' ہی رہ جائیں گے (مسلمؒ عن عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ) چنانچہ قیامت ان ہی پر قائم ہوگی۔ یہ غالباً اس لیے ہوگا کہ صاحب ایمان اور نیک بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے بچالیا جائے۔ چنانچہ صحیح مسلمؒ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس مضمون کی احادیث مروی ہیں کہ جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا وہ دورِ سعادت جتنا عرصہ اللہ چاہے گا قائم رہ چکے گا تو دفعتہً ایک پاک اور ٹھنڈی ہوا ایسی چلے گی جس سے ہر وہ شخص موت کی نیند سو جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا..... چنانچہ اس کے بعد دنیا میں صرف بے ایمان اور بدکار لوگ ہی باقی رہ جائیں گے، اور وہی جہنم کے اخروی عذاب سے قبل ہولناک زلزلۂ قیامت[1] کی سختیاں بھی جھیلیں گے!.....اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے اس سکوت اور توقف کا جو حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار ''خلافت علیٰ منہاج النبوت'' کے قیام کی نوید کے بعد اختیار فرمایا تھا۔ یعنی اس دورِ سعادت کے تذکرے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دورِ نحوست کا ذکر مناسب نہیں خیال فرمایا۔ واللہ اعلم!

[1] ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝﴾ (الحج:۱)

اب جہاں تک ان عظیم حوادث وواقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں، یعنی ایک عظیم، نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰؑ کا نزول، اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور ان کے علاوہ، بلکہ ان ہی کے ذیل میں یاجوج وماجوج کا سیلاب، بیعت مہدیؑ اور ''دابّۃ الارض'' کا ظہور وغیرہ۔ تو واقعہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت تو ان کا ذکر بھی پسند نہیں کرتی، رہے علماء دین تو ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کے لیے ان کا انکار تو ممکن نہیں ہے، تاہم ماضی قریب کے بعض نامور علماء اور مفسرین بھی ان کے بارے میں کم از کم مذبذب اور متردد ضرور رہے ہیں، اور موجودہ علماء میں سے بھی بہت سے ان کی عقلی اور سائنسی توجیہ یا استعاراتی تاویل کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔

اس صورت حال کے بعض اسباب تو عمومی ہیں اور بعض خصوصی۔عمومی اسباب میں سے چند یہ ہیں:

۱) اگرچہ خالص سائنس کی دنیا میں تو نیوٹن کی طبیعات کا دور ختم ہو چکا ہے،لیکن عوامی سطح پر یورپ اور امریکہ تک میں تا حال اس کے جامد نظریات وتصورات کا سکہ رواں ہے، لہٰذا عام طبعی قوانین کے خلاف کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے ذہن بالعموم تیار نہیں ہیں (گذشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے اپنے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے لیے انگلستان کے نومسلم سکالر جناب عبدالحکیم کو دعوت دی تھی، جو حکمت تبلیغ کے تحت مغرب میں اپنا سابق نام گائی ایٹن ہی استعمال کرتے ہیں،اور انہوں نے بھی اپنے ایک خطبے میں اسی بات کی گواہی دی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر لوگ تا حال ذہنی اعتبار سے نیوٹونین فزکس ہی کے دور میں جی رہے ہیں۔)

۲) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی باتوں پر توجہ سے جذبۂ عمل کمزور پڑ جاتا ہے،اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر لوگ کسی ''مردے از غیب'' کے انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اور یہ بات خام اور نیم پختہ اذہان کے اعتبار سے درست بھی ہے!

۳) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان ہی چیزوں کا سہارا لے کر امت کی تاریخ کے دوران مختلف مواقع پر شہرت وعزت اور نام ونمود کے خواہاں حوصلہ مند لوگ مختلف دعوے کر کے عوام کے دین وایمان کے لیے فتنہ کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں،اور کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں!

ان پر مستزاد ہیں وہ دو خصوصی اسباب جن کا تعلق ان دو فتنوں سے ہے جو گذشتہ صدی کے اواخر میں سائنسی عقلیت کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور تا حال پروان چڑھ رہے ہیں۔یعنی (۱) فتنۂ قادیانیت اور (۲) فتنۂ استخفاف وانکارِ حدیث۔ان میں سے مؤخر الذکر نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں میں حدیث نبویؐ کی وقعت و اہمیت کو کم کر دیا ہے۔چنانچہ جن لوگوں کے اذہان اس فتنے سے زیادہ مسموم ہیں وہ تو حدیث نبوی کی حجیت کا صریح انکار کر دیتے ہیں،باقی بھی عملاً اس کی جانب سے ''غض بصر'' اور صرف نظر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔رہا مقدم الذکر فتنہ تو اس کے بانی اور مؤسس نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ غضب ڈھایا کہ نہ صرف خود مجدد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا، بلکہ ؎

''آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کی صفات!''

کی بحث چھیڑ کر اور پھر خود ہی کو مثیل مسیحؑ اور مسیحؑ موعود قرار دے کر نزولِ مسیحؑ کا باب ہی بند کر دیا،(جس کے لیے ''رفع مسیحؑ'' کا انکار بھی لامحالہ ضروری تھا!)

لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان واقعات وحوادث کے سلسلے کی پہلی کڑی،یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے،اب بالکل نوشتۂ دیوار کے مانند سامنے کی بات ہے،اور ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ جہاں تک ان واقعات وحوادث کی ان تفاصیل کا تعلق ہے جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں،ان میں یقیناً استعاراتی زبان بھی استعمال ہوئی ہے،اس لیے کہ اب سے چودہ سو برس قبل آج کے سلاحِ جنگ اور ذرائع رسل ورسائل کا بیان اسی طور سے ممکن تھا،اور مختلف راویوں کی روایات میں لفظی فرق اور زمانی ترتیب کا گڈمڈ ہو جانا بھی عین قرین قیاس ہے۔جہاں تک ان کے مجموعی خاکے کا تعلق ہے،راقم اپنے مطالعہ اور فہم القرآن کی بناء پر پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ قرآن کے فلسفہ وحکمت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور بالخصوص قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جو صفحات گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے۔

۱۸/مئی ۱۹۹۳

باب نہم

اب تک کے مباحث کا خلاصہ

اب آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سلسلۂ مضامین کی کڑیوں کو ذہن میں جوڑ لیا جائے جو اس سے قبل بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز ایک ایسا خیال تھا جو ع ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!'' کے مصداق اپنے بیرونی سفر کے دوران ایک روز اچانک ذہن میں بجلی کی مانند کوند گیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم قرآن مجید میں ''ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ''[1] کے الفاظ پڑھتے ہوئے آرام کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے گذر جاتے ہیں کہ یہ یہود کا ذکر ہے، حالانکہ موجودہ معروضی صورت حال میں ان الفاظ کا مصداق کامل یہود نہیں ہم ہیں! پھر اس پر راقم اپنے قیام حرمین شریفین کے دوران بھی مسلسل غور کرتا رہا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اور اسی غور وفکر کا حاصل تھا جو پہلے ۲۵ مارچ ۹۳ء کو خطابِ عیدالفطر میں بیان ہوا اور اس کے بعد سے زیر نظر مضامین کی صورت میں پیش ہو رہا ہے جو روز نامہ نوائے وقت میں شائع ہوئے۔

[1] ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے عذاب میں گھر گئے!'' (البقرہ:٦١)

اس سلسلے کا پہلا مضمون ''ہیں آج کیوں ذلیل؟'' کے عنوان سے ۱۶ اپریل کو شائع ہوا تھا جو متذکرہ بالا خیال ہی کی وضاحت پر مشتمل تھا کہ آج یہودی تو دنیا میں کل چودہ ملین یعنی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم ہونے کے باوجود بالفعل دولت وثروت اور عزت ووجاہت کی چوٹی پر متمکن ہیں، یہاں تک کہ علامہ اقبال کے اس قول کے عین مطابق کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' وہ دنیا کی عظیم ترین اور وقت کی واحد سپریم پاور یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو کنٹرول کر رہے ہیں، جب کہ ہم مسلمان ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟'' کی سی کیفیت سے دوچار ہیں۔ البتہ یہ وضاحت اسی وقت کر دی گئی تھی کہ یہ صورت حال مستقل نہیں، عارضی ہے اور بہت جلد بالکل برعکس ہو جانے والی ہے۔ پھر ۲۳ اپریل کو شائع ہوئی تھی راقم کی وہ تحریر جس کے بارے میں راقم کو اپنی کم علمی کے باوصف یہ ''زعم'' ہے کہ اس اچھوتے موضوع پر شاید ہی کبھی کسی نے اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہو، یعنی ''قرآن کا قانونِ عذاب''۔ اور اب ہمیں اپنے موضوع کے جس حصے کی جانب پیش قدمی کرنی ہے، یعنی وہ عظیم حوادث اور تباہ کن واقعات جو حدیث نبویؐ میں وارد شدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل قریب میں پیش آنے والے ہیں، ان کے پس پردہ کارفرما حکمت خداوندی کے فہم کے لیے ضروری ہے کہ اس قانونِ عذابِ الٰہی کی بعض دفعات کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ یعنی (۱) اوّلاً یہ کہ یہ دنیا اصلاً دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں! لیکن (۲) یہ قاعدۂ کلیہ پوری طرح صرف افراد پر منطبق ہوتا ہے، قوموں اور ملتوں پر نہیں! (بقول اقبال: ''فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے۔ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!'') چنانچہ قوموں اور اُمتوں کا مجموعی حساب دنیا ہی میں چکا دیا جاتا ہے۔ (۳) دنیا میں ''عذاب اکبر'' یعنی اللہ کے اجتماعی عذاب کی عظیم ترین صورت ''عذابِ استیصال'' کی ہے جس کے ذریعے پوری پوری قومون کو نسیا منسیا کر دیا گیا، اور انہیں بیخ وبن سے اکھاڑ کر ان کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ اور یہ صورت ان قوموں کے ساتھ پیش آئی جن کی جانب کوئی رسولؑ مبعوث کیا گیا اور اُس نے اپنی دعوت وتبلیغ اور قولی وعملی شہادت کے ذریعے اتمام حجت کا حق بدرجۂ تمام وکمال پورا کر دیا، لیکن اس کے باوجود قوم نے بحیثیت مجموعی کفر اور انکار کی روش پر اصرار کیا، جیسے قومِ نوح علیہ السلام، قوم ہود علیہ السلام، قوم صالح علیہ السلام، قوم لوط علیہ السلام، قوم شعیب علیہ السلام اور آل فرعون۔ (۴) اس سے کمتر لیکن پیہم اور متواتر عذاب ان لوگوں پر آتا رہا جنہوں نے رسولوںؑ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اُمت مسلمہ کی حیثیت اختیار کی اور اس حیثیت میں اللہ کے ساتھ عہد ومیثاق کا رشتہ استوار کیا، لیکن پھر امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے قول وقرار سے انحراف کرتے ہوئے شریعت کی حدود کو پامال کرنے اور اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دینے کی روش اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ ہے عذابِ اجتماعی کی وہ دوسری شکل جس کے کوڑے سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی پیٹھ پر بھی پیہم پڑتے رہے، اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی ہم مسلمانوں پر بھی متواتر برس رہے ہیں۔

اس کے بعد جو مضمون جمعہ ۳۰ اپریل اور ہفتہ یکم مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوا اس میں دو نکات کی وضاحت کی گئی یعنی: (۱) یہ کہ اگرچہ دنیا میں انبیاء اور رسول تو بہت سے گزرے ہیں، لیکن صاحب کتاب اور حامل شریعت امتیں پوری انسانی تاریخ کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور (۲) بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک بنی اسرائیل کی لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال کی تاریخ اور امت مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے مابین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک کے مطابق حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے کہ: ''میری امت پر بھی لازماً وہ سارے احوال واقع ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسی مشابہت کے ساتھ جو ایک جوڑی کی ایک جوتی کو دوسری جوتی سے ہوتی ہے!'' (ترمذی عن عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن العاص) چنانچہ اس عرصے کے دوران سابقہ امت مسلمہ بھی دو بار عروج سے ہمکنار ہوئی، اور دو مرتبہ زوال سے دوچار ہوئی اور موجودہ امت مسلمہ یعنی مسلمان بھی دو ہی بار عزت ووجاہت اور قوت وسطوت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہوئے، اور دو ہی مرتبہ ذلت ومسکنت کے قعرِ مذلت کی انتہائی پستیوں میں گرے۔ (بقول اقبال: ''پیش ما یک عالم فرسودہ است۔ ملت اندر خاکِ اُو آسودہ است!'')

اس کے بعد ۷ اور ۸ مئی کو دو ہی قسطوں میں ''بیسیوں صدی عیسوی اور سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں'' کے عنوان سے مضمون شائع ہوا، جس میں واضح کیا گیا کہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب وغریب منظر پیش کرتی ہے کہ اس کے دوران ایک جانب دونوں امتوں پر حسب سابق عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے، چنانچہ یہودیوں پر ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں ہٹلر کے ہاتھوں عذاب الٰہی کا شدید ترین کوڑا پڑا، تو دوسری جانب مسلمانوں میں سے افضل تر حصے یعنی عربوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر پیوست ہوا، اور اس پر مستزاد اس کے ہاتھوں انہیں پہلے ۱۹۴۸ء میں اور پھر ۱۹۶۷ء میں عبرتناک ہی نہیں نہایت شرمناک ہزیمت کا مزہ چکھنا پڑا، یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی ہوئی اور وہ اس کی تولیت سے محروم ہوگئے۔ اور غیر عرب مسلمانوں میں سے بھی پاکستانی قوم کو ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور المیۂ مشرقی پاکستان کی صورت میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن دوسری جانب اس صدی کے دوران دونوں ہی امتوں میں احیاء اور نشأۃ ثانیہ کا عمل بھی شروع ہوا۔ اگرچہ اس کی ترقی اور پیش قدمی کی رفتار سابقہ امت یعنی یہود میں بہت تیز رہی، جب کہ اس کے مقابلے میں امت مسلمہ کا احیائی عمل نہایت سست رفتار رہا۔ چنانچہ یہود کی ترقی کی سرعت رفتار کا عالم تو یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں ان کے چند ''بزرگوں'' (Elders of the Zion) نے جو سکیم تیار کی تھی اس کا پہلا ثمرہ کل بیس ہی برس بعد ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ''اعلان بالفور'' کی صورت میں سامنے آ گیا، اور پھر کل تیس برس بعد ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آ گیا۔ اور اس وقت واقعی صورت حال یہ ہے کہ جہاں ایک جانب اسرائیل بذاتِ خود بھی ایک بہت بڑی عسکری قوت ہے، اور اس پر مستزاد اسے پوری عیسائی دنیا کی حمایت ونصرت بھی حاصل ہے، وہاں دوسری جانب وقت کی واحد سپر یم پاور تو یہود کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے ہی، پوری دنیا کے مالیاتی نظام پر بھی ان کا کامل تسلط ہے اور عالمی معیشت کا لیور تو اس طرح ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں ذرا سی جنبش کے ذریعے عظیم ترین سلطنتوں کو تہہ وبالا اور ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔ (جس کی ایک نمایاں مثال سوویت یونین کا حالیہ حشر ہے!) چنانچہ اس وقت حقیقی اور واقعی صورت حال یہ ہے کہ ''عظیم تر اسرائیل'' کے قیام کے لیے عملی اقدام میں کوئی تاخیر یہود اور اسرائیل کی اپنی حکمت عملی ہی کے تحت تو ہو سکتی ہے، دنیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت بالفعل موجود نہیں ہے جو اس کی راہ میں مزاحم ہو سکے!..... دوسری طرف مسلمانانِ عالم بھی نہ صرف یہ کہ مغربی استعمار کی براہ راست غلامی سے نجات حاصل کر چکے ہیں، بلکہ ان میں اپنے اصل تشخص کی بازیافت اور اپنی تہذیب وتمدن کے احیاء اور اسلام کو ایک ''دین'' یعنی نظام زندگی اور سسٹم آف سوشل جسٹس کی حیثیت سے قائم ونافذ کرنے کی شدید اُمنگ پیدا ہو چکی ہے، جس کی لہر مشرق سے مغرب تک پورے عالم اسلام میں ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم!'' اور ''ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم!'' کی شان کے ساتھ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس ''احیائی دور'' میں یہودی مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اور دراصل اسی معروضی حقیقت میں آئندہ پیش آنے والے عظیم حوادث اور ہولناک واقعات کا راز مضمر ہے جس پر مفصل گفتگو آئندہ ہوگی۔

اس کے بعد دو ہی اقساط میں، یعنی ۱۴ اور ۱۶ مئی کو وہ تحریر شائع ہوئی جس میں ''ابراہیمیؑ مذاہب کا ثالث ثلاثہ'' کے عنوان سے یہ حقائق واضح کیے گئے کہ: (۱) عیسائیت اپنی اصل اور آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً ابراہیمیؑ مذاہب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار سابقہ اُمت مسلمہ ہی کا ''فرقہ'' سمجھے جاتے تھے، لیکن سینٹ پال کی ترمیمات کے نتیجے میں موجودہ عیسائیت ایک بالکل جداگانہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے، جس کا کوئی حقیقی اور معنوی تعلق ابراہیمیؑ مذاہب کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ (۲) یہودیوں اور مسلمانوں، دونوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دور کے ضمن میں یورپ کی عیسائی اقوام ہی ''کوڑے'' کے طور پر استعمال ہوتی رہیں۔ چنانچہ یہودیوں پر بھی چوتھی صدی عیسوی کے بعد سے آج تک سارا تشدد اور کل تعذیب عیسائیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی اور مسلمانوں پر بھی پہلے دورِ عذاب کی ابتداء بھی صلیبیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگرچہ اُس وقت اصل عذاب تاتاریوں کے ہاتھوں آیا تھا، لیکن دوسرے دورِ عذاب کے دوران تو، جو چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہسپانیہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا، عذابِ الٰہی کے تمام کوڑے یورپ کی عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں پڑے۔ (چنانچہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں یہ حقیقت بھی بہت اہم رول ادا کرنے والی ہے!) (۳) یہودیوں نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے ازلی اور جانی دشمنوں یعنی عیسائیوں کو پہلے رام کیا اور پھر باقاعدہ زیر کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے پہلے ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی، پھر مسلم اسپین کو اپنے مورچے اور کمین گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عیسائی یورپ کی فصیل میں نقب لگائی، اور علم وحکمت کے جو سوتے قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں سے پھوٹ کر یورپ کی جانب بہہ رہے تھے ان میں ''لبرلزم'' کے عنوان سے فکری آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا زہر شامل کر کے، ایک جانب یورپ کے معاشرے کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب ''پروٹیسٹنٹ ازم'' کی راہ سے کلیسا کی گرفت کو کمزور کر کے سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح یورپ کو اپنے اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ چنانچہ اس وقت حقیقی اور معروضی صورت حال یہ ہے کہ یورپی عیسائی دنیا پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے ''واسپ'' (White Anglosexen Protestants) کو جن کے سرخیل ہیں امریکہ اور برطانیہ، اور ان کے سر اور شانوں پر سوار ہے ''صیہونیت'' کا سازشی ٹولہ!

اور بالآخر جمعہ ۲۱ مئی اور اتوار ۲۳ مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوئی ''آنے والے دور کی ایک واضح تصویر'' کے عنوان والی تحریر، جس کی پہلی قسط میں سب سے زیادہ حتمی و یقینی اور قطعی وشدنی بات کا تذکرہ ہوا، یعنی قرآنی اصطلاح میں الواقعہ، القارعہ، الحاقّہ اور السّاعہ کا ذکر، جسے عرف عام میں ''قیامت'' کہہ دیا جاتا ہے (حالانکہ اصل قرآنی اصطلاح کے مطابق قیامت کے لفظ کا اطلاق بعث بعد الموت کے بعد حساب کتاب اور جزا و سزا کے فیصلے کے دن یعنی ''یوم الدین'' پر کیا جاتا ہے) اور دوسری قسط میں اس سے قبل کے اتنے ہی حتمی اور یقینی واقعے کا تذکرہ ہوا جو قرآن حکیم سے ''دلالت النص'' اور احادیث نبویہؐ سے ''صراحت النص' کے طریق پر تو ثابت ہے ہی، فلسفۂ اقبال کے شارح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی رائے میں نظریۂ ارتقاء کے بھی منطقی اور لازمی نتیجے کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی اسلام کا عالمی غلبہ اور عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام!

اب آئندہ ہمیں ان عظیم واقعات وحوادث پر گفتگو کرنی ہے جن کی تفصیلی خبریں احادیث نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں، یعنی سلسلۂ ملاحم اور الملحمۃ الکبریٰ، بیعت مہدی، خروجِ دجال، نزولِ مسیحؑ، استیصال یہود اور خاتمۂ عیسائیت، جن کے بارے میں ہم اپنی یہ حتمی اور سوچی سمجھی رائے پیش کر چکے ہیں کہ ان کی واقعاتی تفاصیل اور ان کے وقوع کے ٹائم ٹیبل سے قطع نظر، جہاں تک ان کے مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ دونوں مسلمان اُمتوں کی تاریخ اور قرآن کے اس قانونِ عذاب کے فریم میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے جس کا اجمالی ذکر آج کی صحبت میں بھی ہو گیا ہے۔ آئندہ ہم ان میں سے ایک ایک کے بارے میں مختصر گذارشات پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز!

۳۱/مئی ۱۹۹۳ء

باب دھم

پندرھویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے

بارہ سال قبل کی گزارشات

۲ جون کو نماز عیدالاضحیٰ سے فراغت کے بعد باغ جناح لاہور سے واپس آ کر اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں کسی قدر خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک ذہن اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ غلبۂ اسلام سے قبل کے حوادث یعنی سلسلۂ ملاحم، بیعت حضرت مہدی، خروجِ دجال، نزولِ مسیحؑ، اِستیصال یہود اور عیسائیت کے اسلام میں مدغم ہونے کو کس ترتیب اور اسلوب سے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ اس لیے کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد شدہ خبریں بھی اپنے مقام پر، اور میرا ایمان و یقین اور وثوق و اعتماد بھی اپنی جگہ، لیکن آج کا جدید تعلیم یافتہ انسان ان مباحث سے طبعًا الرجک واقع ہوا ہے اور ان پر گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے بعض مباحث بہت تفصیل طلب ہیں، جب کہ ایک روز نامے کے ''کالم'' کا مزاج اور اس کی محدودیت دونوں ان تفاصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ میں کچھ دیر اسی ادھیڑ بن رہا لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ اب سے دس بارہ سال قبل میں نے اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی تھی، جو ماہنامہ ''میثاق'' میں شائع بھی ہو گئی تھی، کیوں نہ اسے دیکھا جائے شاید کہ معاملہ آسان ہو جائے۔ چنانچہ اسے نکال کر پڑھا تو ایک تو میں خود ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ اب سے ساڑھے بارہ سال قبل جو باتیں بہت دور و دراز نظر آتی تھیں، اس عرصے کے دوران نوشتۂ دیوار کی طرح عالم واقعہ میں رونما ہو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف میری مشکل واقعتاً آسان ہو گئی اور دل نے یہی رائے دی کہ پہلے اس کے متعلقہ حصے قارئین ''نوائے وقت'' کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں، اس سے ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے آ جائے گا۔ پھر بعض معاملات کی کسی قدر وضاحت اور اس عرصے کے دوران پیش آمدہ واقعات سے استشہاد کے ذریعے پورا مرحلہ بآسانی طے ہو جائے گا اور اس طرح ان آراء میں اضافی وزن اس بناء پر پیدا ہو جائے گا کہ یہ خیالات ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید'' کے مصداق خلیج کی جنگ کے بعد پیدا نہیں ہوئے، بلکہ اس سے لگ بھگ دس سال قبل وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکے تھے۔

واضح رہے کہ یہ تقریر میں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اپنے دوسرے سفر امریکہ سے واپسی پر مسجد شہداء، ریگ چوک، لاہور میں کی تھی۔ پھر اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے جوں کا توں ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کی اشاعت بابت جنوری فروری ۸۱ء میں شائع کر دیا گیا تھا۔ سفر امریکہ کے دوران اس موضوع کی جانب میرا ذہن جن اسباب کی بناء پر منتقل ہوا ان میں بعض کا ذکر تو اس تقریر کے آغاز میں موجود ہے لیکن ایک اہم بات، جو اُس وقت بیان ہونے سے رہ گئی تھی، یہ تھی کہ میں نے اپنے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے امریکہ کے سفر کے دوران کثرت کے ساتھ یہ سٹکرز کاروں کے پچھلے شیشوں یا بمپرز پر چسپاں دیکھے کہ ''یسوع مسیحؑ تشریف لا رہے ہیں!'' (Jesus is Coming) جس سے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے ورودِ ثانی کو ہمارے اور عیسائیوں کے مابین ایک بہت بڑی قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ بہرحال اب اس تمہید کے بعد میری اس تقریر کے متعلقہ حصے ملاحظہ ہوں۔ میں نے اب اس میں تقریر کو تحریر کا انداز دینے کے لیے صرف کچھ لفظی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر کا فرق کیا ہے اور بعض غیر ضروری تفاصیل حذف کر دی ہیں، ورنہ اصلاً یہ آج سے ساڑھے بارہ سال قبل ہی کی تقریر ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام اور ماثورہ دعاؤں کے بعد عرض کیا گیا)

حضرات! میری آج کی گفتگو کا عجیب پہلو یہ ہے کہ مجھے اعلان کے مطابق ایک ہی نشست میں دو موضوعات پر گفتگو کرنی ہے، ایک موضوع تو میرے شمالی امریکہ کے حالیہ دورے کے تأثرات و مشاہدات سے متعلق ہے (تقریر کا یہ حصہ اس وقت تو بالکلیہ حذف کیا جا رہا ہے، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی موقع پر اسے بھی ہدیۂ قارئین کیا جائے تو ان شاء اللہ مفید بھی ہوگا اور موجب دلچسپی بھی!) اور دوسرا پندرھویں صدی سے تعلق رکھتا ہے، جس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کو دوسرے مسلمان ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی سرکاری سطح پر منایا جا رہا ہے، بلکہ اس کے استقبال کے لیے کافی پہلے سے مختلف تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ عوام الناس ہی نہیں ہمارے خواص کے بھی قابل ذکر حصے میں چودھویں اور پندرھویں صدی کے متعلق عجیب و غریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ باتیں کچھ تو ہمارے ان واعظین کے باعث پھیلی ہیں جن کا مبلغ علم صرف سنی سنائی باتوں اور سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی معلومات تک محدود ہوتا ہے، پھر اس میں کافی دخل عوام الناس کی اس عادت کا بھی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔

اس موضوع پر کہ اُمت مسلمہ اور ملت اسلامیہ چودہ سو سال میں عروج وزوال کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی ہے اور فی الوقت ہم کس صورتِ حال سے دو چار ہیں، میں پہلے بھی مفصل تقریریں کر چکا ہوں اور امت مسلمہ کے عروج وزوال کے دو دو ادوار کے متعلق میرے تجزیئے اور میرے مطالعے کا حاصل تحریری شکل میں بھی آ چکا ہے، لیکن علم، مطالعہ اور مشاہدہ کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض نئی باتیں حال ہی میں میرے سامنے آئی ہیں، جن کو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان نئی باتوں کی جانب ذہن منتقل ہونے کا سبب یہ حسن اتفاق ہوا کہ شمالی امریکہ میں کافی عرصہ سے ایک اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کا امریکہ کے مختلف شہروں میں ہر سال ایک کنونشن منعقد ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب میں پہلی بار امریکہ گیا تھا تو ڈیلاس میں ان کے سالانہ کنونشن کا انعقاد ہو رہا تھا، جس میں ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ امسال میں جب دوسری مرتبہ دعوتی دورے پر شمالی امریکہ گیا تو ان کا سالانہ کنونشن مشہورِ عالم آبشار نیاگرا کے سامنے نیاگرا سٹی میں منعقد ہونے والا تھا، جس میں شریک ہونے اور آخری اجلاس میں ''پندرھویں صدی ہجری کے چیلنج، خطرات اور توقعات'' کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت وتوفیق سے اس موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جس کے دوران کچھ پہلو اور نکات ایسے ذہن میں آئے کہ میں نے چاہا کہ ان کو آپ کے سامنے بھی بیان کروں۔ (یہ مقالہ پاکستان میں روزنامہ ''مسلم'' اسلام آباد، اور بھارت میں ہفت روزہ ''Radiance'' دہلی میں شائع ہو چکا ہے)

احادیث شریفہ میں قیامت کی جو علامات بتائی گئی ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنیں اور ہم چوکس وہوشیار رہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور اس معاملے میں کوئی مغالطہ لاحق ہو تو اس کو دور کر لیجئے کہ کسی صدی کے تعین کے ساتھ، خواہ وہ چودھویں صدی ہو خواہ پندرھویں صدی، کوئی خبر نہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے نہ احادیث شریفہ میں۔ علاماتِ قیامت کے باب میں احادیثِ نبویہؐ میں غور وفکر کرنے سے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ڈرامہ اپنے ڈراپ سین یعنی اختتام سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وہ نقشہ اور وہ حالات تیار ہوئے نظر آ رہے ہیں جن کی خبریں الصادق المصدوق جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھیں۔ میں ان حالات کا جن سے اس کرۂ ارض کو مستقبل قریب میں سابقہ پیش آنے والا ہے، ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آج کی اس گفتگو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جامعہ مدنیہ لاہور کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ (افسوس کہ مولانا موصوف کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو بالکل اچانک انداز میں ہو گیا غَفَرَ اللّٰہ لنا ولہٗ اَدخِلہ فی اعلیٰ عِلِیّین..... آمین!) سے بہت مدد ملی ہے۔ مولانا موصوف نے اسی موضوع پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر تقریر بھی کی تھی، پھر میرا اس موضوع پر ان سے آج ہی تبادلۂ خیالات بھی ہوا ہے اور اس گفتگو سے میری اپنی سوچ میں مزید پختگی پیدا ہوئی ہے، اور میری ان گذارشات میں ان سے استفادہ بھی شامل ہے۔

قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث نبویہؐ میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان سے ذہن میں آنے والے واقعات وحالات کی ایک ترتیب بھی بنتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعات مختلف مراحل میں رونما ہوں گے۔ ہر مرحلے میں کتنی مدت صرف ہوگی اور کتنا عرصہ لگے گا اس کا تعین ممکن نہیں، لیکن مختلف احادیث نبویہؐ کو جمع کر کے غور وتدبر کیا جائے تو ایک اجمالی نقشہ اور خاکہ ذہن میں ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس طرح جو نقشہ میرے ذہن میں مرتب ہوا ہے، وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

احادیث شریفہ سے ایک بات تو یہ پورے جزم اور یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ وقوع قیامت کے قریب کچھ جنگیں ہوں گی، جن کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ایسی وسعت کی حامل ہوں گی کہ ان کے سامنے سابقہ تمام جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ماند پڑ جائیں گی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے، اس جنگ میں بے پناہ خونریزی ہوگی اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدقوت کو فتح وکامیابی حاصل ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے بارے میں احادیث شریفہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے، عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب، اپنے عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اس کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور یہ تفرقہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلح معرکہ آرائی اور ایک شدید جنگ کی صورت اختیار کر لے گا، جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ چنانچہ ترکی، لبنان، شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے اور دباتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس جنگ میں یہودیوں کی تمام دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہوگا اور ان کا سرمایہ، ان کی ٹیکنیکل مہارت، ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مہیب ومہلک اسلحہ اور ان کے پراپیگنڈے کے ہتھیار سب عیسائیوں کی پشت پر ہوں گے، لیکن خود وہ براہ راست جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ احادیث کے مطابق اس مرحلہ پر حضرت مہدیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوگی، لیکن اسی موقع پر یہ بات بھی جان لیجئے کہ حضرت مہدی کی حدیث نبویؐ میں بیان شدہ شخصیت اور اہل تشیع کی اعتقادی شخصیت میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور ان دونوں کے مابین سوائے لفظ اور نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ وہ جس مہدی کے ماننے والے ہیں، وہ ان کے بارہویں امام ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق روپوش ہو گئے تھے اور کسی غار میں مقیم ہیں اور اُس وقت وہی ظاہر ہوں گے..... ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ احادیث نبویہؐ سے ہمارے سامنے حضرت مہدیؒ کی شخصیت اور ان کے ظہور کا جو نقشہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کے ایک قائد اور ایک رہنما کی

حیثیت سے ابھریں گے۔ان کا نام محمد ہوگا اوران کے والد کا نام عبداللہ۔ وہ بیت اللہ شریف میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی مہدیٔ موعود ہیں۔ وہ خودمہدی ہونے کے دعویدارنہیں ہوں گے، بلکہ لوگ ان کوازخود پہچانیں گےاورکوئی ندائے غیبی اس امر کی تائید کرے گی۔مسلمان ان کی قیادت میں متحداورمجتمع ہوکرعیسائی قوتوں سے جنگ وقتال کریں گےاوران کو پیچھے ہٹاتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ جائیں گے۔اور جب قسطنطنیہ کوعیسائیوں کے چنگل سے آزادکرارہے ہوں گےتو پھرایک اورمرحلہ شروع ہوجائے گا جس کوہم تیسرامرحلہ کہہ سکتے ہیں۔وہ وقت دجالِ اکبر کے ظہور کا ہوگا۔اس کے ظہور کی خبر،اس کے قبضے میں غیرمعمولی اسلحہ اورعجیب وغریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آناًفاناً پھیل جائے گی۔بعض احادیث میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران کا شہر) بتائی گئی ہے،لیکن وہ خودبھی یہودی النسل ہوگا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہرناقابل تسخیرقوت اس کی پشت پر ہوگی۔وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پرحملہ آور ہوگا۔عیسائی قوتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اورمسلمانوں کودوبارہ شدید ہزیمت وشکست سے دوچارہونا پڑے گا اور وہ شدیدنقصانات اٹھاتے ہوئے حضرت مہدی کی قیادت میں دمشق کی طرف پلٹیں گے.....احادیثِ نبویہؐ کی روسے یہ وقت ہوگا عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کا،جس کاذکرمیں آگے چل کرکروں گا۔

یہاں تھوڑا سا توقف کرکے اس بات کوسمجھئے کہ احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے کیسے کیسے سخت مراحل اورصبرآزما امتحانات آنے والے ہیں،اوران کے جلو میں تباہی، ہلاکت اورخون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں۔ہمیں بالعموم یہ کہہ کرتھپکی اورلوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرھویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہےاورروشن مستقبل ہمارا منتظر ہےاورہم خوش ہوجاتے ہیں اوران ''امانی'' سے بہل جاتے ہیں اورہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جواعلائے کلمۃ اللہ،احقاقِ حق ابطالِ باطل،اورغلبۂ دینِ متین کی سعی وجہد کے ضمن میں ہرکلمہ گو کے ذمے ہیں۔حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کن انتہائی کٹھن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا ہےاورقطرے کے گہرہونے تک اس پر کیا کچھ بیتنے والی ہےاو ران امتحانوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لیےہمیں حقیقی ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔مشرقِ وسطیٰ میں سلطنت اسرائیل کے قیام اوردنیا بھر سے لاتعداد یہودیوں کی وہاں منتقلی، پھر ان ممالک کی طرف سے، جوعظیم اکثریت کے لحاظ سے عقیدۃً عیسائی ہیں ''اسرائیل'' کی سرپرستی اورمعاونت۔اوراس کی جارحانہ اورتوسیع پسندانہ پالیسی کوپیش نظررکھئے اورغورکیجئے کہ مستقبل میں کون کون سے علاقے محاذِ جنگ بننے والے ہیں۔

بہرحال صحاح ستہ جیسی بلند پایہ کتب احادیث کےعلاوہ دوسرے،بہت سے مجموعوں کے ذریعے جوروایات ہم تک پہنچی ہیں،ان میں قطعیت اورصراحت کے ساتھ دجال اکبر کے ظہوراورحضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی سال وسن اورصدی کےتعین کے بغیرخبریں دی گئی ہیں۔ان احادیث صحیحہ کی روشنی میں ہمارااس بات پرکامل ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم بنفس نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے.....صحیح مسلم، جامع ترمذی،سنن ابوداؤداورسنن ابن ماجہ میں نزول مسیحؑ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ''دجال جب مسلمانوں کو پامال کرتا ہوادمشق کا محاصرہ کرلے گا تواللہ تعالیٰ مسیحؑ ابن مریم کوبھیج دے گا،اوروہ دمشق کے مشرقی حصے میں،سفید مینار کے پاس زردرنگ کے دوکپڑے پہنے ہوئے،دوفرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔جب وہ سرجھکائیں گےتوایسامحسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سراٹھائیں گےتوموتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظرآئیں گے،ان کے سانس کی ہواجس کافرتک پہنچے گی،اوروہ حدنظرتک جائے گی،وہ کافرزندہ نہ بچے گا۔پھرابن مریمؑ دجال کا پیچھا کریں گےاورلُدّ کے دروازے پراسے جا پکڑیں گےاورقتل کردیں گے۔'' ایک اورحدیث میں دجال کےظہور کےسلسلہ میں آتا ہے کہ ''پھرعیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گےاوراللہ تعالیٰ دجال کوافیق کی گھاٹی کےقریب ہلاک کردے گا۔''ان احادیث میں دجال کےقتل کا مقام لُد اورافیق کی گھاٹی کا قرب بیان کیا گیا ہے،توجان لیجئے کہ لُد (لِدّا) فلسطین میں اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چندمیل کے فاصلے پرواقع ہےاور یہ اسرائیل کا سب سے بڑاہوائی اڈہ ہے۔افیق آج کل فیق کے نام سے موسوم ہے۔یہ شام اوراسرائیل کی سرحد کےقریب شام کا آخری شہر ہے،جس سے آگے اسرائیل کی سرحدشروع ہوجاتی ہےاور لد کے ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ان واضح احادیث اورتھوڑے سےلفظی اختلاف کے ساتھ اسی مضمون کی بہت سے احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نزول فرمانے والے بنفس نفیس وہی حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہوں گے۔احادیثِ صحیحہ میں یہ وضاحت وصراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں بحیثیت نبی تشریف لائیں گے، بلکہ اُس وقت ان کی حیثیت خاتم النبیین آخرالرسل جناب محمدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کی ہوگی۔احادیث میں ان کے نزول کا وقت نمازِ فجر کےقریب بیان ہوا ہےاور یہ بات بھی مذکور ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ آپ آگے بڑھئے اورنماز کی امامت فرمائیے،لیکن آنجنابؑ انکارکردیں گےاورکہیں گے کہ تمہارے امام ہی کوآگے بڑھنا چاہئے۔چنانچہ وہ حضرت مہدیؒ کی اقتداء ہی میں نماز ادا کریں گے۔صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''کیسے ہوگے تم لوگ جب کہ تمہارے درمیان ابن مریم اتریں گےاورتمہارا امام اس وقت تم ہی میں سے ہوگا۔''اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں..... یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ ان کی حیثیت امت محمدعلیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک امتی کی ہوگی اورامت مسلمہ کانظم برقراررہے گا۔

نزولِ مسیح علیہ السلام کے سلسلے کی جملہ احادیث پر غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزول کا اصل مشن دجال کا قتل اور یہود کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ چونکہ قرآن حکیم میں رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ جن قوموں کی طرف رسولوں کی براہ راست بعثت ہوتی ہے وہ اگر بحیثیت مجموعی رسول پر ایمان لانے سے انکار کر دیں تو ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ جیسے قومِ نوح، قوم لوط، قوم صالح اور قوم شعیب علیہم السلام پر عذاب استیصال کے نزول اور ان کی ہلاکت و بربادی کا قرآن حکیم میں تفصیل سے متعدد بار ذکر ہے۔ از روئے قرآن مجید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ کے آغاز میں فرمایا ''وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ''...... لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کے جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کیا گیا، ان پر عذاب استیصال نہیں آیا، لہٰذا ان کی ہلاکت کا مرحلہ سنت اللہ کے مطابق ابھی آنا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا جن کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور ان ہی کے ہاتھوں سے یہود سنت اللہ کے مطابق برباد، ہلاک اور نیست و نابود کر دیئے جائیں گے اور ان کا بالکلیہ استیصال ہوگا۔ یہودیوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ نزولِ مسیحؑ کے بعد عیسائیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور تمام دنیا پر دین الحق کی حکمرانی ہوگی، اور اس طرح ''لِیُظۡهِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ'' کی شان بکمال و تمام سارے عالم پر ظاہر ہو جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری و مسلم اور ترمذی و مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ دیں گے (فیکسر الصلیب) اور خنزیر کو ہلاک کریں گے (ویقتل الخنزیر) اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔ دوسری روایت میں جزیئے کا لفظ ہے۔ یعنی جزیہ ختم کر دیں گے (ویضع الحرب او یضع الجزیة) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔'' تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح سند کے ساتھ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں۔ ان تمام احادیث میں ''یکسر الصلیب'' اور ''یقتل الخنزیر'' اور ''یضع الجزیة'' کے جو الفاظ آئے ہیں اس کا مفہوم تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ صلیب کو توڑنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت ایک الگ مذہب کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی...... حضرت مسیح علیہ السلام اپنے نزول کے بعد خود اعلان فرمائیں گے کہ میں خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا بندہ ہوں ''اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ''...... نہ ہی مجھے صلیب پر چڑھایا گیا تھا بلکہ مجھے میرے رب نے آسمان پر زندہ اٹھا لیا تھا۔ نہ میں نے خنزیر کو حلال کیا تھا اور نہ ہی میں نے شریعت کو ساقط کیا تھا اور ساتھ ہی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق فرمائیں گے۔ نتیجتاً عیسائیت ختم ہو جائے گی اور ''یضع الجزیة'' یعنی جنگ یا جزیہ کو ختم کر دینے کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کے بعد امتوں کا اختلاف ختم ہو جائے گا، دوسرے تمام مذاہب و ادیان بھی مٹ جائیں گے اور سب لوگ ملتِ اسلام میں شامل ہو کر ایک امت واحدہ بن جائیں گے۔ اس طرح نہ جنگ و قتال کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق آسمان سے رحمتیں نازل ہوں گی اور زمین اپنے تمام پوشیدہ خزانے اور برکتیں اُگل دے گی۔

متعدد احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فتنۂ دجال کے فرو کرنے، یہودیوں کا استیصال کرنے، تمام باطل ادیان کو محو اور تمام ملل و امم کو ملت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ضم کرنے کے بعد چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ چنانچہ مسند احمد میں ایک روایت آتی ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دجال کے قصے میں بیان کرتی ہیں کہ ''پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔'' بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی بھی ہوگی، وہ صاحب اولاد ہوں گے، پھر ان کا انتقال ہوگا، اور وہ ''کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ'' کے اٹل قانونِ قدرت سے دوچار ہوں گے یعنی ان پر بھی طبعی موت واقعہ ہوگی جیسے ہر ذی نفس پر واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کی تدفین بھی اس حجرۂ شریف میں ہوگی جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے دو جاں نثار ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفون ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ احادیث نبویہؐ میں قربِ قیامت کے متعلق جو علامات اور پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں وہ ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ گویا آخری سین کے لیے اسٹیج تیار ہو رہا ہے۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر تھے ان کی اسرائیل کے نام سے فلسطین میں ایک آزاد و خود مختار ریاست آج سے تقریباً تینتیس سال قبل قائم ہو چکی ہے (اب اسرائیل کے قیام پر پینتالیس سال بیت چکے ہیں۔) جہاں تمام دنیا سے سمٹ سمٹ کر یہودی جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا سرمایہ، ان کی قابلیت، ذہانت اور مہارت مجتمع ہو کر عالم اسلام کے لیے ایک خطرہ بن چکی ہے۔ اس خطرے کا عملی مظاہرہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں شام، اردن، لبنان اور مصر کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہوا جو آج تک برقرار ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس پر بھی وہ قابض ہے اور اس کی حرمت اس کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے دلوں میں اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آخری کتاب، آخری اور مکمل دین و شریعت سے جو بغض و عداوت اور حسد پیدا ہوا تھا اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے، حالانکہ یہ امویوں، عباسیوں، فاطمیوں اور عثمانیوں کی مسلم حکومتیں ہی تھیں جنہوں نے یورپ کے متعصب عیسائی حکمرانوں کے جور و ستم اور ظلم و تعدی سے یہودیوں کو نجات دلائی تھی اور جن کی زیر عافیت یہ باقی بھی رہے اور پھلتے پھولتے

بھی، لیکن ان کا سازشی اور انتقامی ذہن اسلام کی سلامت روی اور انسان دوستی سے بالکل متاثر نہیں ہوا.....اسی یہودی ذہن کی کرشمہ سازیاں ہیں جو آج دنیا میں مادہ پرستانہ فکر ونظر کی شدت کی صورت میں ظاہر ہیں۔عریانی، فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے جو مناظر آج دنیا دیکھ رہی ہے، اس کی ترویج میں بہت بڑا حصہ ان ہی یہودی دانشوروں اور سرمایہ داروں کا ہے۔ یورپ کے متعدد ممالک اور خاص طور پر امریکہ کے ذرائع ابلاغ، اخبارات ورسائل، ریڈیو، ٹی وی اور فلمی صنعت پر زیادہ تر ان ہی کا قبضہ ہے۔یہی حال بڑی بڑی صنعتوں اور بینکاری کا ہے۔جن اداروں پر ان کا براہِ راست قبضہ نہیں ہے وہ ان کے زیر اثر ہیں۔ایوانِ حکومت میں بھی وہ بہت بااثر ہیں۔کتنے کلیدی عہدے ان کے پاس ہیں۔علامہ اقبال نے آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے کہا تھا کہ ع ''فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' تو آج یہ صورت حال زیادہ روشن اور واضح طور پر دنیا کے افق پر نظر آ رہی ہے۔سود خوری یہود کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا گوشت پوست اور خمیر اسی حرام کی غذا سے بنا ہے۔آج اسی یہودی ذہن کی سازش کے باعث دنیا کی تمام معیشت سودی لین دین کی لعنت میں گرفتار ہے، پھر اس کو فریب اور پُرکاری کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ لوگ اس کی مضرتوں کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔

اس وقت مشرق وسطیٰ جس نازک صورت حال سے دوچار ہے، اس پر غور کیجئے۔بہت سے مسلم ممالک جن میں مصر خاص طور پر قابل ذکر ہے چاروناچار امریکہ کی طرف جھکتے چلے جا رہے ہیں، اور کچھ ایسا نقشہ جمتا نظر آ رہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑنے کا وقت دور نہیں.....اور اگر یہ جنگ چھڑی تو سب سے بڑا میدان جنگ مشرق وسطیٰ ہی ہوگا اور عجب نہیں کہ بیشتر مسلم ممالک خواہی نخواہی امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شامل ہوں، اور دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔گویا احادیث نبویہؐ میں جس عظیم جنگ کی خبر دی گئی تھی کہ ایک زبردست اور خونریز وتباہ کن جنگ ہوگی جس میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے، اس کے آثار سامنے نظر آ رہے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ اس متوقع ہولناک تباہی کے ظہور میں آنے میں کچھ اور وقت لگے، لیکن موجودہ حالات کی سنگینی بتا رہی ہے کہ یہ جنگ اور ٹکراؤ ناگزیر اور اٹل ہے۔یہودی اس جنگ میں یقیناً امریکہ ہی کے حلیف ہوں گے، کیونکہ امریکہ کی حمایت ہی میں اس سرطان نے مشرق وسطیٰ میں اپنے پنجے گاڑے ہیں اور امریکہ ہی اس وقت ان کا سب سے بڑا حامی ومددگار ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے دلوں میں متوقع جنگ کے بعد یہودی ہی نفرت کا بیج بونے کا کردار ادا کریں گے اور پھر دجال کی قیادت میں عیسائی مملکتوں کی تائید واعانت حاصل کر کے مسلمانوں پر یلغار کریں گے اور مسلمان شکست وہزیمت سے دوچار ہوں گے۔یہی وقت ہوگا حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کا اور یہی دور ہوگا جب یہودیت کا بالکلیہ استیصال ہوگا اور عیسائی دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے گا۔کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ امن وسلامتی کا دور کتنے سال اور کتنی صدیوں تک رہے گا، لیکن بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انسانیت کا قافلہ پھر صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹ کر شیطان کی بتائی ہوئی پگڈنڈیوں میں بھٹک جائے گا۔حتیٰ کہ زمین اللہ تعالیٰ سے بغاوت وسرکشی کی وجہ سے ظلم وستم اور جور وتعدی سے معمور ہو جائے گی، شر غالب ہوگا اور خیر مغلوب ہی نہیں، ناپید اور معدوم ہو جائے گا۔یہ زوال دنیا کا خاتمہ لے کر آئے گا اور وہ ساعت جس کو ہم قیامت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی خبر قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے دی گئی ہے، آئے گی اور یہ دنیا تہہ وبالا اور ملیامیٹ کر دی جائے گی۔نظامِ ثقل درہم برہم ہو جائے گا، اس وسیع وعریض کائنات میں پھیلے ہوئے عظیم الشان ستارے اور کُرے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ عالم تہس نہس ہو جائے گا۔

حاصل کلام یہ کہ یہ کائنات مشیت وحکمت خداوندی کے تحت اپنی اجل مسمّٰی یعنی قیامت کی طرف گامزن ہے اور اس انجام سے لازماً دوچار ہوگی جو اس کا مقدر ہے، لیکن اس انجام کے وقت سال، سن یا صدی کا تعین کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، جیسا کہ سورۂ لقمان کی آخری آیت اور حدیثِ جبریلؑ سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔البتہ یہ گھڑی آ کر رہے گی، اس میں شک کرنا کفر ہے۔پھر اس آخری گھڑی کے آنے تک امت مسلمہ اور بنی نوع انسان جن حالات سے دوچار ہوں گے اس کا جو نقشہ احادیث نبویہؐ سے سامنے آتا ہے، اس کو بھی میں نے بیان کر دیا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ قرآن وحدیث میں کسی صدی کے تعین کے ساتھ کوئی خبر نہیں دی گئی ہے، لیکن احادیث میں جو علامات بیان ہوئی ہیں وہ ہم کو چشم سر سے نظر آ رہی ہیں اور صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمیں بہت کٹھن مراحل اور سخت امتحانات سے گزرنا ہے، اور یہ محض خام خیالی ہے کہ پندرھویں صدی از خود ہمارے لیے غلبۂ اسلام کی نوید لے کر آ رہی ہے۔خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی اُمت مسلمہ کو کن کن صدموں اور حادثوں سے دوچار ہونا ہے، البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک دور لازماً آئے گا جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا.....بڑے نصیبے والے ہوں گے وہ لوگ جو اس غلبۂ اسلام میں حضرت مہدیؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیر قیادت فی سبیل اللہ اور غلبۂ دین حق کے لیے جہاد وقتال میں اپنے جان ومال کی قربانیاں پیش کریں گے اور بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے جو غلبۂ اسلام کے اس دور کا نظارہ بھی سر کی آنکھوں سے کریں گے اور اس کی سعادتوں سے متمتع اور مستفیض بھی ہوں گے۔

(نوٹ: یہاں اب سے بارہ سال قبل کی گزارشات اختتام کو پہنچیں!)

۷/ جون ۱۹۹۳ء

باب یازدھم

دوشبہات اوران کے جواب

ان صفحات میں جو بحث چل رہی ہے اس کے ضمن میں جو مسائل زیر بحث آ رہے ہیں ان کے بارے میں میں اپنی یہ تشویش بیان کر چکا ہوں کہ ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ طبعاً ''الرجک'' ہے اوران پر بحث وگفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔اس سے قبل یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ فتنۂ انکارِ سنت اور استخفافِ حدیث کے زیر اثر نہ صرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بلکہ بہت سے نوجوان ''علماء'' بھی ان مسائل سے ''غض بصر'' اور صرفِ نظر ہی کو مناسب خیال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان موضوعات پر گفتگو کے سلسلے میں راقم کو کچھ اور ''اندیشے'' بھی تھے کہ اس گفتگو سے کوئی منفی تاثرات نہ لے لیے جائیں!

چنانچہ حال ہی میں راقم کو اپنی متذکرہ بالا تشویش اور اندیشوں کے دو شواہد موصول ہوئے۔ چنانچہ ایک تو خط ہے جو نیویارک سے موصول ہوا۔مراسلہ نگار پروفیسر میاں ابراہیم ہیں (۲۸۸۔ایسٹ، سٹریٹ ۸، بروکلن، نیویارک۔۱۱۲۱۸) اور اس کے آغاز اور اختتام کے یہ جملے پورے مکتوب کا حاصل اور لب لباب ہیں: ''امید ہے کہ مزاج خوشگوار ہوں گے۔ روزنامہ نوائے وقت میں آپ کے مضامین ابراہیمیؑ مذاہب کا ثالث ثلاثہ، اور آنے والے دور کی واضح تصویر کا مطالعہ کیا۔آپ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے.....ان مضامین کے لکھنے سے آپ کا مقصد جو کچھ بھی ہو، آپ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن قاری صرف یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ آپ مسلمانوں خصوصاً بوسنیا اور مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو بشارت دے رہے ہیں کہ ظلم وستم کا ہر وار نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شکر الحمدللہ پڑھ کر برداشت کیے جاؤ۔ قیامت سے قبل ابن مریمؑ تشریف لائیں گے اور ظالموں سے انتقام لے لیں گے!''

دوسرا منفی ردّعمل ''بالمشافہ'' موصول ہوا۔اور وہ اس طرح کہ ملتان سے دو نوجوان علماء نے شدرحال فرما کر لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی، تاکہ مجھے ''مطلع'' کریں کہ میری ان تحریروں سے یہ تأثر عام ہو رہا ہے کہ میں خود ''مہدی موعودؑ'' ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہوں۔لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل کچھ وضاحتیں ان دو امور کے بارے میں پیش کر دی جائیں۔

ان میں سے جہاں تک مؤخرالذکر بات کا تعلق ہے اگرچہ اس پر صرف ''اِنَّا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھ دینا بھی کافی ہے۔تاہم شاید اس پر مستزاد یہ وضاحت مفید ہو کہ جن احادیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جب مسلمانانِ عرب پر شدید مصائب کا دور آئے گا اللہ تعالیٰ انہیں ایک مؤمن ومتقی اور باہمت وصلاحیت قائد عطا فرمائے گا، جو دشمنوں کے مقابلے میں ان کی سپہ سالاری کے فرائض باحسن وجوہ سرانجام دے گا۔ان ہی میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ وہ قائد موعود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد میں سے ہوگا۔ جب کہ میں تو اپنے بارے میں اب سے چھ سات سال قبل اپنی تالیف ''استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ'' (صفحات ۱۰۹۔۱۱۲) میں صراحت کر چکا ہوں کہ اگرچہ میری والدہ مرحومہ صدیقی یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے تھیں، لیکن میرا ددھیال خالص ہندی الاصل ہے۔چنانچہ میں نے اپنے بارے میں علامہ اقبال کا وہ شعر بھی نقل کیا تھا جو انہوں نے ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا.....یعنی: ؎

میں اصل کا خاص سومناتی
آباء مرے لاتی و مناتی

لہٰذا میرے لیے تو یہ دروازہ بند ہے ہی، میرے نزدیک تو آج تک جس ''غیر فاطمی'' نے کبھی مہدیٔ موعود ہونے کے خواب دیکھے یا دعویٰ کیا وہ صریح تضاد کا شکار ہوا کہ اس نے حضرت مہدی کی بشارت تو احادیث نبویؐ سے اخذ کی، لیکن ان کے خصائص اور حسب نسب کی ان تفاصیل کو سرے سے نظرانداز کر دیا جو خود ان احادیث ہی میں وارد ہوئی ہیں۔رہا عقل و منطق کا معاملہ تو حضرت مہدی کے بارے میں جو خیالات اہل سنت کے ہیں کم از کم ان میں تو کوئی بات نہ عقل کے نزدیک محال ہے، نہ عام قوانین طبعی کے خلاف، بلکہ اس قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے کہ جب فتنہ وفساد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بالآخر وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ؎

خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری!

اس لیے کہ اگر خون اسرائیلؑ میں اتنی حرارت تھی تو خونِ اسماعیلؑ اتنا سرد، اور عترتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بانجھ کیوں ہو جائے گی کہ عظیم فتنہ وفساد کے وقت کوئی ہادی ومہدی پیدا نہ کر سکے!

بہرحال، راقم کے نزدیک تو ایمان بالرسالت کا تقاضا یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد شدہ تمام خبروں کو تسلیم کیا جائے، خواہ وہ عام عقل انسانی اور اب تک کے دریافت شدہ قوانین طبعی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، لہٰذا حضرت مہدی کے بارے میں کسی شک یا شبہ کا کیا سوال جب کہ ان کے ضمن میں تو کوئی خلافِ عقل یا مخالفِ قوانین طبعی بات کم از کم احادیثِ نبویہؐ میں موجود نہیں ہے..... تاہم حضرت مہدی کے معاملے میں راقم کی اصل دلچسپی اس حدیث کی بناء پر ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بلادِ مشرق سے ان کی مدد کے لیے فوجیں جائیں گی۔ ("یخرُج ناسٌ من المشرق یوطون للمهدی یعنی سلطانه" رواه ابن ماجه عن عبدالله ابن الحارث رضی الله تعالیٰ عنه)..... تو کاش کہ راقم اور اس کے ساتھی اور جمیع مسلمانانِ پاکستان اپنا تن من دھن اس ارضِ پاکستان میں جو بلادِ عرب کے مشرق میں واقع ہے اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کھپا دیں، تاکہ نہ صرف اس سرزمین میں جہاں سے ''میر عرب'' صلی اللہ علیہ وسلم کو بقولِ اقبال ٹھنڈی ہوا آئی تھی، خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے، بلکہ پھر یہیں سے مسلمانانِ عرب کی مدد کا سامان فراہم ہو سکے..... اور اس طرح اگر ہماری مساعی ان لشکروں کا راستہ صاف کرنے میں کام آ جائیں جو حضرت مہدی کی مدد کے لیے جائیں گے تو ہماری سعادت اور فوز و فلاح کے لیے یہی کافی ہے..... اور جیسا کہ بعد میں تفصیل سے واضح کیا جائے گا، اسرائیل کے وجود میں آنے سے ایک سال قبل پاکستان کا خالص معجزانہ طور پر قیام مشیت ایزدی میں یقیناً اسی کی تمہید ہے.....!!

جہاں تک پہلے منفی تاثر کا تعلق ہے تو مختصر ترین الفاظ میں گذارش ہے کہ پیشینگوئیاں صرف احادیث نبویؐ ہی میں بیان نہیں ہوئیں خود قرآن میں بھی وارد ہوئی ہیں، لیکن ان سے وہ مطلب نکالنا جو پروفیسر ابراہیم صاحب نے نکالا ہے کسی طرح درست نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اہم ترین اور نمایاں ترین پیشینگوئی وہ تھی جو سورۃ الروم کے آغاز میں وارد ہوئی، یعنی:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝

''قریب کی سرزمین (یعنی شام) میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر دوبارہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کل معاملہ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس روز اہل ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے طفیل فرحاں و شاداں ہوں گے۔ اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (آیات ۲ تا ۵، زمانۂ نزول لگ بھگ ۶۱۴ء)

چنانچہ یہ اعجازِ قرآنی کا بہت عظیم مظہر ہے کہ نو ہی سال بعد یعنی ۶۲۳ء میں ایک جانب قیصر روم ہرقل کو ایرانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی بدر میں کفار مکہ پر عظیم فتح حاصل ہوئی اور اس طرح یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔ لیکن ذرا پروفیسر ابراہیم صاحب غور فرمائیں کہ کیا آج سے چودہ سو سال قبل بھی کسی شخص نے قرآن کی ان آیات سے یہ مطلب نکالا ہو گا کہ ان کے ذریعے قرآن ایک جانب رومیوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، بلکہ ایرانیوں کی خدمت میں دست بستہ ''سرِ تسلیم خم'' کیے رکھو۔ اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کر رہا ہے کہ کفر اور اہل کفر کے مقابلے کی کوئی سعی کرو، نہ جانفشانی اور سرفروشی سے کام لو، بلکہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو اور صرف اللہ کی مدد کا انتظار کرتے رہو؟ اور اگر بفرضِ محال کسی نے ان آیات مبارکہ سے یہ مطلب اخذ کیا ہو تو کیا اس کا کوئی الزام قرآن پر آئے گا؟

اسی طرح اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور کے بھی آغاز ہی میں یہ ''خوش خبری'' دے دی تھی کہ اے مسلمانو! عنقریب قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں تلے ہوں گے، تو کیا اس سے مراد یہ تھی کہ تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہو، یہ انقلابِ عظیم از خود اور خود بخود رونما ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس ''پیشینگوئی'' سے یہ مطلب اخذ کرنا نہ اُس وقت درست تھا، نہ آج درست ہے!

کاش کہ پروفیسر ابراہیم صاحب اور ان کی طرز پر سوچنے والے تمام حضرات کو معلوم ہو کہ ع ''میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو'' کے مصداق راقم کی تو پوری زندگی کی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہی یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ؎

''خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!''

کے مصداق اپنی حالت بدلنے پر آمادہ کرے، لیکن اس کے لیے ظاہر ہے کہ یہ لازم ہے کہ موجودہ حالات کا صحیح اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور ملت کے امراض کی صحیح تشخیص کی جائے، تاکہ صحیح اور مفید و مؤثر علاج تجویز کیا جا سکے۔ اور ایسا نہ ہو کہ پوری توجہ کو صرف ظاہری علامات ہی کے ازالے پر صرف کر کے قیمتی وقت ضائع کر دیا جائے اور اس طرح مہلت اصلاح ختم ہو جائے اور بالآخر سوائے ناکامی و نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ آ سکے۔ چنانچہ جس طرح کبھی علامہ اقبال نے فرمایا تھا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

اور

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

یعنی ''اے اُمت مسلمہ! تو ذلیل وخوار تو اس سبب سے ہوئی ہے کہ تو نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے، لیکن تو شکوہ گردشِ دوراں کا کر رہی ہے!'' اور ''اے وہ قوم! جو شبنم کے مانند زمین پر پڑی ہوئی ہے (اور دشمن اسے پاؤں تلے روندرہے ہیں!) تیری بغل میں وہ کتاب زندہ موجود ہے (جو تجھے اس ذلت ورسوائی سے رستگاری عطا کرسکتی ہے!)''.....اسی طرح ان گزارشات کے ذریعے امت مسلمہ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہم اس وقت درحقیقت اس جرم کی پاداش میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہیں کہ ہم دنیا میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے، اور اس کے دین حق کے علمبردار ہونے کے مدعی ہو کر اپنے عمل کے ذریعے ان سب کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اور ؎

''فلک کا جورِ مسلسل جواب دے اس کا
ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟''

کے سوال کا صرف ایک جواب اور وہ یہ کہ اس عذاب الٰہی سے نجات کے حصول کا راستہ صرف یہ ہے کہ ہم ابتداءً کم از کم کسی ایک خطۂ ارضی میں اللہ کے کامل دین حق اور اس کے معتدل اور متوازن نظامِ عدل اجتماعی کو بلا کم وکاست قائم کر کے اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کر دیں اور اس طرح شہادت علی الناس کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں جس کے لیے ہمیں بحیثیت امت برپا کیا گیا تھا۔ اور ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' کے مصداق اگر ہم اس بنیادی جرم سے باز نہیں آتے اور اس اصل کوتاہی کی تلافی نہیں کرتے تو نہ امریکہ کی کاسہ لیسی ہمارے امراض کا ازالہ کرسکتی ہے نہ کوریا کی نقالی ہماری ترقی اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ ؎

''اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ!''

کے مطابق امت مسلمہ کا معاملہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نہیں بلکہ ہر اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے۔

اب اس سے پہلے کہ کتب حدیث کے ''ابواب ملاحم'' یعنی تاریخ انسانی کے آخری دور میں پیش آنے والی عظیم اور تباہ کن جنگوں کے سلسلے کے تذکرہ پر مشتمل ابواب کی چند اہم احادیث اور ان میں سے خاص طور پر ایسی احادیث کا تذکرہ کیا جائے جن میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کا عالم واقعہ میں ظہور بالکل ایسے انداز میں شروع ہو چکا ہے جیسے صبح طلوع ہوتی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ عالم مادی میں وہ عظیم جنگیں جن اسباب کی بناء پر ظہور میں آئیں گی ان سے قطع نظر مشیت ایزدی میں ان کی غرض غایت کیا ہوگی؟

یہ بات ان احادیث سے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہی ہے کہ ان جنگوں کا میدان مشرقِ وسطیٰ بنے گا، عالمی حالات اور واقعات بھی ایک عرصہ سے اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ آئندہ جنگ عظیم یعنی اس صدی کی تیسری عالمگیر جنگ یورپ میں نہیں، مشرق وسطیٰ میں لڑی جائے گی۔ اس لیے بھی کہ یورپ دو عالمگیر جنگوں کی تباہی برداشت کر کے اب اتنا ''سمجھدار'' ہو گیا ہے کہ تیسری جنگ کا میدان اپنے علاقے کو نہیں بننے دے گا، اور اس لیے بھی کہ عہد حاضر کی سب سے زیادہ قیمتی متاع یعنی تیل کے عظیم ترین ذخائر اسی علاقے میں ہیں جسے بجا طور پر سیال سونا کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس علاقے میں موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل ترحصہ یعنی ''اُمیین'' یا عرب مسلمان تو چودہ سو برس سے آباد ہیں ہی، اس صدی کے آغاز سے سابقہ اور معزول شدہ امت مسلمہ یعنی یہودیوں کی بھی از سرنو آبادکاری زور وشور کے ساتھ شروع ہو گئی تھی، جو عنقریب اپنے کلائمیکس کو پہنچ جائے گی اور پوری دنیا سے تمام یہودی کشاں کشاں یہیں آ کر آباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان عظیم جنگوں یا سلسلۂ ملاحم کے ذریعے ہولناک تباہی کی صورت میں اللہ کے قانونِ عذاب کے مطابق شدید ترین کوڑے ان ہی دونوں پر پڑیں گے، لیکن ان کے مابین بالآخر ایک عظیم فرق وتفاوت ظاہر ہوگا۔ یعنی سابقہ معزول، مغضوب اور معلون امت یعنی یہود پر تو اللہ کے اس ''عذابِ اکبر'' کے فیصلے کا نفاذ ہوگا جس کی مستحق وہ حضرت مسیحؑ کے کفر اور آنجنابؑ کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھوا دینے کی بناء پر اب سے دو ہزار برس قبل ہو چکی تھی، لیکن جس کے نفاذ کو ایک خاص سبب سے مؤخر کر دیا گیا تھا، چنانچہ اب اسے ان ہی حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے اور مسلمانوں کے ہاتھوں نسیاً منسیا اور نیست ونابود کر دیا جائے گا، بالکل جیسے حضرات نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کی اقوام اور آل فرعون اپنی اپنی جانب بھیجے جانے والے رسولوں کی نگاہوں کے سامنے ہلاک کئے گئے

تھے۔لیکن اس کے برعکس چونکہ موجودہ امت مسلمہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق خود آخری امت کی حیثیت رکھتی ہے، مزید برآں وہ صرف ایک نسل پر مشتمل نہیں بلکہ ''ملٹی نیشنل'' امت ہے، لہٰذا اسے اس کے جرائم کے بقدر سزا دینے کے بعد توبہ کی توفیق اور اصلاح کا موقع عنایت کر دیا جائے گا، جس سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور دین حق کے غلبے کا دورِ ثانی شروع ہوگا، جو اس بار پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا، جس کی صریح اور واضح خبریں دی ہیں جناب صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے، اور جس کی کوئی ادنیٰ جھلک اور دھندلی تصویر دیکھ لی تھی چودھویں صدی ہجری کے نابغہ اور وژنری علامہ اقبال نے جس پر وہ خود بھی حیرت واستعجاب کی تصویر بن کر رہ گئے تھے کہ: ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اور ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اور یہ غالباً صرف اس افضل ترین امت کے بھی افضل ترحصے کی سزا میں ایک انگریزی محاورے کے مطابق ''تکلیف پر توہین کے اضافے'' (To add insult to injury) کی غرض سے ہوا ہے کہ ایک مغضوب وملعون اور "Condemmed" قوم کو دو ہزار سال تک باقی بھی رکھا گیا اور پھر عارضی طور پر سنبھالا بھی دیا گیا، (اگرچہ اس کے لیے یہ مرنے والے مریض کے آخری سنبھالے یا بجھنے والی شمع کی آخری بھڑک کی حیثیت رکھتا ہے) تاکہ موجودہ امت مسلمہ کے افضل ترین حصے کو اس کے ہاتھوں پٹوا کر گویا وہ صورت پیدا کر دی جائے جو یوپی کے دیہات میں اختیار کی جاتی ہے، یعنی یہ کہ کسی شخص کی سزا میں توہین وتذلیل کا عنصر شامل کرنے کے لیے اسے کسی چمار کے ہاتھوں جوتے لگوائے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم!

۱۵/ جون ۱۹۹۳